سلسلۂ مطبوعات ادارۂ طلوعِ اسلام ۶

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی

یعنی

نیشنلزم اور اسلام

شائع کردہ

ادارۂ طلوعِ اسلام
بلی ماران دہلی

منصور حیدر راجہ

قیمت فی نسخہ دو آنے ۲ر

Title - MUTHIDAH QAUMIYAT AUR MAULANA HUSSAIN AHMAD SAHAB; YAANI NATIONALISM AUR ISLAM.

Creator - Hussain Ahmad Sb. Raazi.

Publisher - Daftar Taloo Islam Billi Maraan (Delhi)

Date - 1357 H.

Pages - 60

Subjects -

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ طلوعِ اسلام

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

یعنی

نیشنلزم اور اسلام
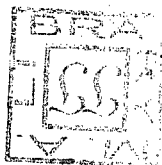
ادارۂ طلوعِ اسلام
بلّی ماران دہلی

قیمت فی نسخہ دو آنے ۲ر

مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ واردھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے قیمت ۴ر محصولڈاک ار

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱ر

سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگریسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۱ر

زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے تھا بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں قیمت ۱ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

(رازی)

ہندوستان کی سیاستِ حاضرہ میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت ہے یہی وہ منحوس دوراہہ ہے جہاں پہونچکر ملتِ اسلامیہ کے افراد ایک دوسرے کو ھٰذا افراقُ بَینِی وَ بَینِکَ کہہ کر الگ الگ جماعتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں اور پھر یوں ایک دوسرے سے منہ موڑتے ہیں کہ گویا ان میں کبھی کوئی چیز وجہ جامعیت تھی ہی نہیں یہی وہ بدبخت چٹان ہے جس سے ٹکرا کر امتِ مسلمہ کی کشتی پاش پاش ہوچکی ہے اور اسکے منتشر تختے مختلف موجوں کے ساتھ اس بیکسی کے عالم میں بہے جا رہے ہیں جیسے گنگا میں لاشیں تیر رہی ہوں۔ قوم کی اجتماعیت فنا ہوچکی ہے انکی متحدہ قوتیں باہمی تخریب و استہلاک میں صرف ہو رہی ہیں مسلمان کا گلا مسلمان کے ہاتھوں کٹ رہا ہے۔ اور دوسری طرف وہ قوم جس نے اپنے استادانِ سیاست سے سیکھا ہے کہ کسی قوم کو تباہ و برباد کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان میں باہمی تفرقہ پیدا کر دو۔ نہایت اطمینان سے مسلمانوں کی طرف سے بالکل بےفکر ہو کر۔ اپنی آنیوالی حکومت کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

سال گزشتہ کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک نہایت اہم بحث کا سلسلہ چھڑا تھا۔ مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں" چونکہ یہ نظریہ اسلام کے شجرِ طیب کی جڑ و بیخ پر تبر چلانے کے مرادف تھا اسلیے ملتِ اسلامیہ کے قلبِ حساس میں اس سے ایک ٹیس پیدا ہوئی اور آہِ آتشیں کی شکل میں ان الفاظ میں لب تک آپہونچی کہ:۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ! چہ بیخبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر با و نرسیدی تمام بولہبی است (اقبالؒ)

ملّت کا نصیبہ یاوری کرتا تو مولانا صاحب حضرت علامہؒ کے انہی اشارات سے متنبہ ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ ان کو جرأت عطا کر دیتا تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی فرما لیتے کہ کون سا انسان ہے جسے معصوم عن الخطاء ہونیکا دعوےٰ ہو سکتا ہے لیکن ہماری شورِیدہ بختی کہ ایسا نہ ہوا اور مولانا صاحب نے اعترافِ حقیقت کے بجائے "عذرِ گناہ" کا مسلک اختیار فرما لیا اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک مبسوط بیان شائع کر دیا جس میں سب سے پہلے یہ فرمایا کہ میں نے اپنی تقریر میں قوم کا لفظ استعمال کیا تھا اور حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں اسے لفظ ملت سے تعبیر کیا ہے جو عربی میں قوم کے لیے نہیں۔ بلکہ دین اور شریعت کے لیے مستعمل ہے۔ اس لیے حضرت علامہؒ کا الزام غلط ہے، اور اسکے بعد اپنے نظریہ کی توضیح ان الفاظ میں فرمائی۔

(۱) موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل و مذہب سے۔

(۲) قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت ہو۔ خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت یا نسل یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفتِ معنوی یا مادی وغیرہ۔

(۳) یہ دعوےٰ کہ اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے مجھے معلوم نہیں کہ کون سی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔ (مدینہ مورخہ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۳۸ء)

جن خوش بخت حضرات کو حضرت علامہؒ کے قرب کی سعادت نصیب تھی انکا بیان ہے کہ انہوں نے (حضرتِ علامہؒ نے) جب اس بیان کو پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے کہ یا اِلٰہُ العالمین! اس ہندوستان میں تیرے اس پیغامِ ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے! جہاں کے مفتیانِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اُس نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اور جب تک اسے عملاً فنا نہیں کر دیا گیا دین کی تکمیل اور اتمامِ نعمت کا اعلان نہیں ہوا۔ حضرت علامہؒ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دَورے پڑ رہے تھے

لیکن مسئلہ کی اہمیت اتنی تھی کہ انہوں نے جان تک کی پروا نہیں کی۔ اور اس کے متعلق ایک نہایت بسیط اور جامع بیان اخبارات میں شائع فرما دیا۔ اور یوں اس مسلسل جہاد کی تکمیل فرما دی جسکے اندر انکی تمام زندگی صرف ہوئی تھی۔ وہ جواب اس قدر مسکت اور مستحکم تھا کہ مولانا صاحب کو کہنا پڑا کہ میرا مقصد وہلی کے بیان میں اخبار تھا انشا نہ تھا "متحدہ قومیت اور اسلام" یعنی یہ کہ میں نے صرف یہ بتایا تھا کہ آجکل تو یہ کا نظریہ یہ ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ تم بھی اپنی قومیت کی بنا جغرافیائی حدود قرار دے لو۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ انتقال فرما گئے۔ اور یوں اس بحث کا دروازہ بند ہو گیا لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد مولانا صاحب نے مرحوم کے آخری بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کرا دیا۔ جو اسوقت ہمارے زیر نظر ہے اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ مولانا صاحب اس سے متعلق پمفلٹ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب شائع فرما دیتے۔ لیکن ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ جس انداز سے یہ پمفلٹ لکھا گیا ہے وہ کچھ پسندیدہ نہیں ہے اس میں اظہارِ حقیقت سے زیادہ زور حضرت علامہؒ کی تردید میں صرف کیا گیا ہے اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک صفحہ سے اُبلتے نظر آ رہے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ اس تحریر کا محرک کون سا جذبہ تھا۔ اسمیں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں جبکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ فریقِ ثانی موجود ہی نہیں ہے۔ جو کسی کے جی میں آئے کہہ ڈالے۔ اس سے کہنے والے کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے لیکن یہ طرزِ عمل کس چیز کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں حضرت علامؒ زندہ ہوتے تو ملتِ اسلامیہ کے سامنے۔ اس پمفلٹ کے جواب کے بہانہ سے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب اُن کی جگہ لینے والا کون ہے لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ:-

اگرچہ میکدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی!
وہ مے۔ وہ خم، وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اور خم کدۂ اقبالؔ میں ایسے ایسے رندانِ قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشمِ مست کے صدقے شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں۔ طلوعِ اسلام۔ جسے پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ وہ سعید روحیں جو تلاشِ حقیقت میں مضطرب و بیتاب رہتی ہیں۔ کسی صحیح نتیجہ پر پہونچکر سامانِ تسکین حاصل کریں وَمَا توفیقی اِلَّا باللّٰہ۔

طرزِ استدلال

آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ ہمارے قومیت پرست حضرات اپنے دعاوی کی تائید میں ایک عجیب حربہ سے کام لیتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہو کہ وہ چاروں طرف سے گھر جائیں۔ کوئی راہِ مفر نظر نہ آئے۔ جواب بن نہ پڑے۔ دلائل عاجز آجائیں۔ تو اُسوقت اُنکے ترکش کا آخری تیر نکلتا ہے اور وہ فریقِ مقابل سے نہایت جرات و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ تم برطانیہ پرست ہو۔ سامراج کے حامی ہو۔ انگریز کے پٹھو ہو۔ رجعت پسند ہو۔ ٹوڈی ہو۔ آزادی کے دشمن ہو اور اسکا اس زور سے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ اصل موضوع اس شور میں گم ہو کے رہ جاتا ہے ہمارا خیال تہا کہ ان اوچھے ہتھیاروں پر عام سطح کے لوگ ہی اُترتے ہونگے لیکن ہمیں یہ دیکھکر بیحد تاسف ہوا کہ مولانا صاحب نے بھی اس باب میں اِسی حربہ سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جن اخبارات نے اُنکے پہلے بیان کی مخالفت کی تھی۔ انکے متعلق ارشاد ہے۔

"اگرچہ بہ حیثیت واقعہ بہت سے اشخاص سے غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا ہے۔ اور ان برطانیہ پرست اخباروں کی افترا پردازی اور جھوٹے پروپیگنڈے کا پردہ اُٹھ گیا ہے"۔

(متحدہ قومیت اور اسلام صـ)

ذرا آگے بڑھ کر تحریر فرماتے ہیں:۔

"برطانیہ کے ازلی وفاداروں کو کب ایسی بات کا تحمل ہو سکتا تہا" (ایضاً صـ)

اپنے اِس رسالہ کے متعلق یوں پیش بندی کرتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جنکو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جنکے دماغ اور قلب طاغی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں۔ اُمید نہیں کہ وہ اسکو قبول کرینگے"۔ (ایضاً ص۱۰)

جن حضرات کی نگاہیں نفسیاتِ انسانی پر ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی پیش بندیوں کی ضرورت کب اور کیوں لاحق ہوا کرتی ہے، یہ ابتدا میں لکھا اور آخیر میں جاکر اسے پھر دُہرا دیا کہ:۔

"جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست میں اُترنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کو بھیانک صورتیں ظاہر کرکے نفرت دلا رہے ہیں، بلاشک وشبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں جو اسکی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں

(متحدہ قومیت اور اسلام ص۷۶)

یہاں تک بھی خیر تھی۔ لیکن ۔ درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں ۔ کہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ۔ سنیئے اور داد دیجیے، کہ ۔ خود حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

"یہ امر یقینی اور غیر قابلِ انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے وہ آسمانِ حکمت وفلسفہ شعر وسخن تحریر وتقریر۔ دل ودماغ اور دیگر کمالاتِ علمیہ وعملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔ مگر باوجود کمالاتِ گوناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا۔ اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں" (ایضاً ص۷)

یہ مطلع تھا مقطع ملاحظہ فرمایئے:۔

"غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سرسید جیسے تجربہ کار عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا۔ اور اسی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے علیحدہ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا پھر اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے"۔ (ایضاً ص۴۲)

غالبؔ کو کسی مخالف نے ماں کی گالی دی تو اُسنے کہا تھا کہ ان بد مذاق۔ کور ذوق لوگوں کو گالی دینے کا

سلیقہ بھی نہیں آتا۔ غالب شاعر تھا۔ اس لیے اُس نے اس چیز کو کور ذوقی پر محمول کیا لیکن اِس کور ذوقی کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب آدمی کے اعصاب پر انتقامی جذبات کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کا عقلی توازن قایم نہیں رہتا اور اسکے بعد اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں ورنہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علامہؒ کے متعلق اور جو کچھ جی میں آئے کہہ لیجیے۔ شاید کوئی نہ کوئی ایسا مل جائے جو اسے باور کر لے لیکن انکے متعلق یہ کہنا کہ وہ سحر برطانیہ سے مسحور ہو چکے تھے ایک ایسا الزام ہے جسے تسلیم کرنے کے لیے کوئی صحیح الدماغ آدمی تیار نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ جو شخص اقبالؒ سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان کی تمام زندگی سحر برطانیہ اور افسونِ افرنگ کے خلاف ایک مسلسل جہاد تھی۔ اور ان کی زندگی کا یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کا اعتراف خود اُنکے مخالفین تک کو تھا۔ اُنکے کلام پر اگر کوئی صاحب نظر دو لفظوں میں تبصرہ کرنا چاہے تو بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ وہ

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ

کی افسون شکن تشریح ہے۔ وہ اقبالؒ جس کی تمام عمر یہ کہتے کہتے گزر گئی کہ:-

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر ⁂ فتنہ ہا در آستینِ او نگر ⁂

از فریبِ او اگر خواہی اماں ⁂ اشترانش را ز حوضِ خود براں ⁂

وہ جسنے "کفن دُزدانِ یورپ" کی انسانیت سوز و سیہ کاریوں کے خلاف ایک مسلسل صدائے احتجاج ان الفاظ میں بلند کی ہو کہ۔

آدمیت زار نالید از فرنگ ⁂ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ ⁂

وہ جو ان کے متعلق اس نتیجہ پر پہونچ چکا ہو کہ۔

جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

اور اس لیے ایک صدائے ربانی بنکر آخری سانس تک یہی تلقین کرتا رہا ہو کہ:-

مومنِ خود۔ کافرِ افرنگ شو[1]

---

[1] حضرت علامہؒ کے کلام سے اِس عنوان پر اگر تمام اشعار جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ (بقیہ حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

اُس اقبالؒ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "ساحرین برطانیہ" کے جادو سے مسحور ہو چکا تھا یا تو بقول غالب اپنی انتہائی بدمذاقی کا ثبوت دینا ہے یا مغلوب الغضب ہونے کا اعلان کرنا ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم ۔ اور اُس طبقہ میں بالخصوص جو انگریزی خواں نہیں ہے سحر یورپ کے خلاف جس قدر بغاوت اور تنافر کے جذبات پائے جاتے ہیں یہ رہین منت ہیں ۔ اُسی مرد حق آگاہ کی سعی پیہم کے، کس قدر ظلم ہے کہ بجائے اسکے کہ مولانا صاحب انگریزی نہ جاننے والے طبقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے حضرت علامہؒ کے اس احسان کے لیے اظہار شکر فرماتے ۔ وہ ان کے خلاف اس حربہ کو لے کر میدان میں اُتر آئے جس کی زد اچٹ کر خود اپنے ہی اوپر آپڑے کہ :۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد .:. عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اگر حضرت علامہؒ کے خلاف عوام کو بھڑکانا ہی مقصود تھا تو اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ اُنکا فوٹو دیکھ لو ڈاڑھی کہاں ہے ؟

اور پھر آپنے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ یہ سحر برطانیہ کا طعنہ دیا کس موقع پر جاتا ہے ۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ "آجکل قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں ۔ مذہب سے نہیں بنتیں" حضرت علامہؒ کا ارشاد ہے کہ یہ نظریہ کہ قومیت کی بنا وطنیت پر ہے ساحرین یورپ کا پیدا کردہ ہے ۔ اسلام مسلم قومیت کی بناء خالص ایمان پر رکھتا ہے لہذا اسلام کا نظریہ قومیت ۔ یورپ کے نظریہ قومیت کے بالکل خلاف ہے ۔ اسکے جواب میں مولانا صاحب کا فتویٰ ہے کہ اقبالؒ ساحرین یورپ کے دام تزویر میں گرفتار تھا ۔

یعنی

جو شخص یورپ کے ایجاد کردہ نظریہ کی تائید کرے وہ تو رئیس الاحرار ہے ۔ اسپر سحر یورپ کا کوئی اثر نہیں

اور

جو شخص اسکی مخالفت کرے اور یہ بتلائے کہ یہ سحر یورپ ہے اس سے بچ کر رہنا ۔ وہ ساحرین یورپ کے سحر

(بقیہ حاشیہ) اُس جہ باید کرد کے مندرجہ صدر اشعار یونہی اسوقت ذہن میں آگئے ہیں ۔ استیعاباً اسپر کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ شخص جس نے کلام اقبال کو سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے اُسے معلوم ہے کہ طلسم فرنگ کی انہوں نے کس حد تک نقاب کشائی کی ہے ۱۲

میں گرفتار ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اِن حضرات کے نزدیک سحرِ برطانیہ سے تو وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو کفر و اسلام کے امتزاج سے ہندوستان میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کی حمایت کرے۔ اپنی کوئی رائے نہ رکھے۔ بلکہ کانگرس کی پاس کردہ تجاویز کے لئے آلہ مکبر الصوت (Loud Speaker) کا کام دے۔ کانگرسی ائمہ سیاست کی اقتدار میں "جو نیت امام کی سو میری" کہہ کر انکی آواز پر اُٹھتا اور جھکتا چلا جائے۔ ہائی کمانڈ کے فتاوے کے نیچے "الجواب صحیح" لکھ کر مُہر تصدیق ثبت کر دے۔ اور جو ایسا نکرے۔ اسکے متعلق اعلان کر دے کہ اُسے انسان کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

وہی جذبہ انانیت و خود پرستی جو کبھی اپنے آپ کو نحن ابناء اللہ (اللہ کی چاہیتی اولاد) اور دوسروں کو لیسوا علی شیء (عقل و بصیرت سے عاری) سمجھنے پر آمادہ کرتا تھا۔ جو اس دعویٰ کا محرک ہوتا تھا کہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھوداً او نصاریٰ (جنت میں وہی جاسکے گا جو ہمارے مسلک کی تائید کریگا)۔ آج وہی جذبہ اپنے آپکو رئیس الاحرار اور باقی مسلمانوں کو ذلیل و خوار غلام سمجھنے کا محرک بن رہا ہے۔ روح وہی کارفرما ہے جو اقوام سابقہ کے احبار و رہبان میں ہنگامہ خیز تھی۔ صرف قالب میں فرق ہے۔

اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات ۔۔۔ بدلتے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں

اقبال رح

تضاد بیانات

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ مولانا صاحب نے حضرت علامہ رح کی زندگی میں اپنی غلطی کو اس نقاب میں چھپانے کی کوشش کی تھی کہ دہلی کی تقریر سے انکا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ آجکل یورپ میں قومیت کے متعلق اس قسم کا نظریہ قایم ہوچکا ہے۔ اس سے مفہوم یہ مشورہ دینا نہیں تھا کہ مسلمان بھی اپنی قومیت کی تشکیل اُنہی خطوط پر کریں۔ اسکا اعتراف خود رسالہ زیر نظر میں بھی موجود ہے۔ جہاں فرماتے ہیں:-

جس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم کو میرے بعض احباب کے خطوط کے جواب سے معلوم ہوا۔ دہلی کی تقریر میں مشورہ دینا مقصود نہ تہا اور نہ کوئی لفظ اس کا ذکر کیا گیا تہا"

(متحدہ قومیت اور اسلام)

لیکن اب مولانا صاحب نہ صرف اس نظریہ کا مشورہ ہی دیتے ہیں بلکہ اسے قرآن کریم سے ثابت کر کے بطور مذہبی فریضہ کے پیش کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور (معاذ اللہ) اسے خود نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں کو اس اسوۂ حسنہ کیطرف دعوت دیتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لیۓ اپنے ضائع شدہ حقوق حاصل کرنیکا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں

"ایسے مقاصد کے لیۓ متحدہ قومیت غیر مسلموں کے ساتھ بنانا خود جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے" (ایضاً ص۲۴)

اور اسکی اس شدت سے تائید فرماتے ہیں کہ:۔

"بنا بریں متحدہ قومیت کا جاذبہ (جو کہ ان مختلف مذاہب ہندیہ میں بجز وطنیت اور کسی ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا) پیدا ہونا اور نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہونا ازبس ضروری ہے"

(متحدہ قومیت اور اسلام ص۲۶)

معلوم نہیں کہ جس مسئلہ کو حضرت علامہؒ کی زندگی میں محض اخبار (خبر دینے) کی حیثیت سے پیش کیا گیا تہا اب کون سے مصالح سامنے آ گئے کہ اسے انشا کی حیثیت دی جاری ہے اور مسلمانوں کے دین اور دنیا کا تحفظ اسی کے اندر بتایا جارہا ہے اسمیں شبہ نہیں کہ سیاسی معاملات میں عوام کا حافظہ کمزور ہوا کرتا ہے لیکن اتنا بھی کمزور نہیں جتنا مولانا صاحب خیال فرما رہے ہیں

لغوی بحث

مولانا صاحب نے فروری ۱۹۳۸ء میں جو بیان شائع فرمایا تہا اسمیں تمام قوت اس بات کے ثابت کر دینے میں صرف فرما دی تہی کہ میں نے "قوم" کا لفظ استعمال کیا تہا اور حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں

لفظ "ملت" لکھا ہے جو قوم کے لفظ سے بالکل جداگانہ مفہوم پر دلالت کرتا ہے ہم نے اپنے مضمون نظریۂ قومیت مطبوعہ طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۳۸ء میں عرض کیا تھا کہ ایک ایسے اہم مسئلہ کو لغوی بحث کے لفظی گورکھ دھندوں میں الجھاکر یہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنے دعوے کو نہایت محکم دلائل سے ثابت کر دیا ہے اپنے آپکو دھوکہ دینا اور قوم پر ظلم کرنا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ متحدہ قومیت کا تصور از روئے اسلام جائز ہے یا نہیں ؟۔ اس سوال کو اِس بحث سے کیا تعلق کہ لفظ ملّت بمعنی قوم استعمال ہوتا ہے یا نہیں ؟ رسالہ زیرِ نظر جب ہمارے سامنے آیا تو چونکہ اسکا عنوان تھا "متحدہ قومیت اور اسلام" ہمیں خوشی ہوئی کہ مولانا صاحب جیسے عالمِ متبحر نے اپنے اسلامی نقطۂ نگاہ سے اِس موضوع پر روشنی ڈالی ہوگی لیکن ہماری مسرت بہت جلد مبدل بہ تاسف ہوگئی جب ہم نے دیکھا کہ مولانا صاحب نے ایک نہیں دو نہیں بیس بائیس صفحات پھر اِس تحقیق انیق کی نذر کر دیے ہیں کہ قوم کے معنی ملت کے معنوں سے مختلف ہیں اور اس میں بڑی بڑی بوجھل عربی لغت کی کتابوں مثلاً مختار الصحاح۔ قاموس۔ تاج العروس۔ مجمع البحار۔ المنجد وغیرہ کے حوالوں سے اپنے دعوے کی تائید فرمائی ہے ہم تو اِس چیز کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ نفسِ موضوع کو بالآخر اس لغوی بحث سے تعلق کیا ہے یا تو مولانا صاحب خود ہی یہ نہیں سمجھ سکے کہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کیا۔ اور یا وہ دانستہ فریق مقابل کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے بوجھ سے ڈرانا چاہتے ہیں۔ اِس اسلوب مباحثہ سے ہمیں ایک مناظرہ کا قصہ یاد آگیا ایک مولوی صاحب تھے فنِ مناظرہ میں طاق لیکن ویسے بالکل کورے۔ فریق مقابل ایک پڑھے لکھے فارغ التحصیل طالب العلم تھے۔ اول الذکر مولوی صاحب کو فکر دامنگیر ہوئی کہ نفسِ موضوع پر بات چھڑ گئی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائیگا۔ اِس لئے انہوں نے بساطِ مناظرہ پر شاطرانہ چال سے کام لینے کی ٹھانی۔ اُٹھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب سب سے پہلے یہ فرمایئے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کلمہ ہے یا نہیں۔ مولوی صاحب کے دماغ میں پوری صرف و نحو چکر لگا رہی تھی۔ وہ اِس نحوی غلطی کے کس طرح مرتکب ہو سکتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں! یہ کلمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الکلمۃ لفظ مفرداً (کلمہ لفظِ مفرد کو کہتے ہیں) مناظر مولوی صاحب نے بلند آواز سے کہا کہ لو بھائی مسلمانو! جو شخص مسلمانوں کے کلمہ کو کلمہ ہی نہیں مانتا اِس سے ہماری بحث کیا ہو سکتی

ہے مسلمانوں کی باہمی بحث تو ان سے ہو سکتی ہے جنکا کلمہ ایک ہو۔ عوام کی جانے بلا کہ نحوی مولوی صاحب نے کیا کہا۔ انہوں نے اتنا ہی سمجھا کہ یہ تو واقعی کلمہ کا بھی قائل نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسکے بعد کیا ہوا ہوگا۔

قوم وملت کے لغوی گورکھ دھندے سے کچھ اسی نہج کی بحث مولانا صاحب چھیڑ دیتے ہیں اور آپ یہ سنکر انگشت بدنداں رہ جائینگے کہ خود مولانا صاحب کو اس امر کا اعتراف ہے کہ حضرت علامہؒ نے ملت کا لفظ قوم ہی کے معنوں میں استعمال کیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"مگر دوسری حیثیت سے کہ جناب ڈاکٹر صاحب مسلمانان ہند کو قومیت متحدہ کا مشورہ دینا خلاف دیانت سمجھتے ہیں۔ اور یہ امر میرے نزدیک صحیح نہیں ہے"۔ (متحدہ قومیت اور اسلام ص)

اب آپ خود اندازہ فرمالیجیے کہ مولانا صاحب کا اتنی طول طویل لغوی بحث سے مطلب کیا ہے۔ یہ تو رہا خود انکا اعتراف۔ لیکن اگر بحث کا فیصلہ اس لغوی اعتبار سے ہی کرنا ہو تو وہ تو ایک فقرہ میں ہو سکتا ہے بے شک عربی میں قوم کے معنی جماعت اور گروہ کے ہیں اور ملت کے معنی شرع و دین کے لیکن حضرت علامہؒ نے اشعار مذکورہ صدر فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ فارسی میں ملت بمعنی جماعت اور گروہ آتا ہے یا نہیں؟ اسکے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں

"اور اگر غور کیا جائے تو متاخرین عرب اور فارسیوں اور ترکوں نے بھی لفظ ملت کو قوم کے معنی میں کہیں بھی استعمال نہیں کیا"۔ (متحدہ قومیت اور اسلام ص ۱۵)

لیکن ہم نہایت ادب سے گزارش کرینگے کہ جہاں انھوں نے عربی کے اتنے اتنے ضخیم لغت کھنگالے تھے اگر فارسی کے ایک چھوٹے سے لغت مثلاً غیاث اللغات کی ورق گردانی کی تکلیف گوارا فرمالیتے تو اسمیں نہایت آسانی سے نظر آجاتا کہ ملت کے معنی جماعت اور گروہ کے بھی لکھے ہیں۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

پھر یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ مولانا صاحب نے "متحدہ قومیت" کے معانی متعین کرنے کا جو طریق

اختیار فرمایا ہے وہ اصولی طور پر غلط ہے۔ وہ پہلے لغت سے لفظ قوم کے معنی متعین فرماتے ہیں یعنی گروہ
جماعت اور پھر لفظ متحدہ کے یعنی جن میں باہمی اتحاد ہو اور اسکے بعد جھٹ سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتے
ہیں کہ متحدہ قومیت کے معنی ہیں دو قوموں کا باہمی اتحاد کے رشتہ سے منسلک ہونا اور اسکے بعد فتوی ہی
صادر فرما دیتے ہیں کہ کہئے یہ کس طرح اسلام کے منافی ہے یہ ہے لے دے کے خلاصہ ان کی تمام لغوی
بحث متعلقہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کا۔ اسی سے تو ہم سمجھے ہیں کہ مولانا صاحب پر غالباً ابھی تک
یہ بھی واضح نہیں ہوا کہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ "متحدہ قومیت" یا (Nationalism)
دورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جسکے معانی دورِ حاضرہ کی سیاسی روشنی میں ہی متعین کیے
جا سکتے ہیں نہ کہ اس زمانہ کے کتبِ لغت سے جن میں اس اصطلاح کا کہیں ذکر تک نہ ہو۔ اس طرح
اصطلاحات کے معانی متعین کرنے سے تو اصلی مطلب کبھی سامنے نہیں آسکتا۔ دورِ
حاضرہ کی مختلف سیاسی اصطلاحات کو لیجیے۔ مثلاً ترکِ موالات۔ عدم تشدد۔ مخلوط
انتخاب۔ گول میز کانفرنس۔ بین الاقوامی وفاق (FEDERATION OF STATES)
وغیرہ۔ اور ان کے معانی پرانی کتب لغت سے متعین کیجیے۔ پھر دیکھئے
اصلی مطلب کس طرح خبط ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مصطلحاتِ مروجہ
کے معانی ہمیشہ اُس زمانہ اور اُس ماحول کے ماتحت لینے پڑینگے
جس میں کسی اصطلاح کا رواج ہوا ہو۔ لہٰذا جب ہم "متحدہ قومیت" کو اسلام کی میزان سے تولنا
چاہیں گے تو پہلے یہ تعین کرنا ضروری ہوگا کہ متحدہ قومیت سے مراد کیا ہے۔ اسکے بعد دیکھیں گے کہ
اسلام اسکے متعلق کیا کہتا ہے یہ ہے صحیح طریقہ کسی واضح نتیجہ تک پہنچنے کا۔ آیئے پہلے متحدہ قومیت کے
معانی متعین کر لیں۔

باب دوم

متحدہ قومیت کا مفہوم

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متحدہ قومیت (Nationalism) دورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جو بالخصوص ہندوستان میں فرقہ داری (Communalism) کے مقابلہ میں رائج کیگئی ہے اس اصطلاح کے معانی متعین کرنے کے لیے ہمیں ان سیاسی مدبرین کی تحریروں اور تقریروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جنھوں نے اس اصطلاح کو رائج کیا ہے۔ مولانا صاحب نے خود فرمایا ہے کہ کانگرس نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۵ء میں اپنا پہلا اور ضروری مقصد حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا تھا:۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے، ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۵۳)

لہٰذا متحدہ قومیت کے معنی کانگرسی حضرات کے ہاتھ ہمیں مل سکیں گے اور وہ بھی عصرِ حاضرہ کے کانگرسی حضرات سے کہ اس مسئلہ نے اتنی اہمیت حال ہی میں اختیار کی ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں:۔

"ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا ہو۔"

(جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس سے اتنا تو معلوم ہوگیا کہ جس متحدہ قومیت کا نقشہ کانگرس کے ذہن میں ہے وہ آج موجود نہیں ہے بلکہ وہ کوشش کرنے کے بعد پیدا ہوگی۔ آج مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ اسلیئے یہ شکل متحدہ قومیت کی نہیں ہے۔ متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی کیا ہونگے اسکی تفصیل ذیل کی سطور میں ملیگی۔

عنصر اول مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:۔

آج مسلمانوں کی الگ تہذیب ہے اور ہندوؤں کی الگ۔ ان دونوں تہذیبوں کے امتزاج

سے متحدہ قومیت کی تہذیب مرتب ہوگی۔" (ہریجن مورخہ ۲۹ بحوالہ اسٹیٹسمین)
اسکی تفسیر سوامی سمپورنانند۔ وزیر تعلیم، یوپی، ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہیے ...... جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائینگی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ ہو سکے گی۔" (ٹریبیون و مدینہ)

کانگرس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب اسکی تشریح میں یوں رطب اللسان ہیں:۔

"اسی اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اسی نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔" (الجمعیۃ۔ رجب ۱۳۵۶ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوگا ایسی تہذیب جو نہ مسلمانوں کی ہو، نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب پیدا ہو۔
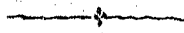
عنصر دوم آج مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور ہندوؤں کا الگ، اسلیئے متحدہ قومیت ابھی وجود میں نہیں آسکتی۔ اسکے لیئے ضروری ہے کہ دونوں مذاہب ملاکر ایک ایسا مذہب پیدا کیا جائے جو دونوں کا مشترکہ مذہب بن سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید محمود صاحب، وزیر تعلیم صوبۂ بہار اپنے ایک مضمون میں اکبر کے دین الٰہی کیطرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں:۔

"بعض نے اپنے ولولہ اور جوش سے مجبور ہوکر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشو ونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جاسکتیں" (جامعہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء)

آنریبل مسٹر کے ایم منشی۔ ہوم منسٹر حکومت بمبئی نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔

"جس قدر رجحانات مذہب یا زبان یا ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل کی بناء پر قومیت پرستی

کے خلاف پیدا ہوتے ہیں۔ کانگرس ان رجحانات کی مخالفت میں ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ من حیث القوم ہماری کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے ایک واہمہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مذہب یا زبان کا رشتہ قومیت کے رشتہ کی جگہ وجہ جامعیت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بڑا مُہلک دھوکا ہے۔ یاد رکھیئے مذہب یا زبان کا رشتہ ہمیشہ قومیت کے بلند ترین رشتہ کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ یہ تصور ہی ہندوستان کو محکم اور آزاد بنا سکے گا"۔ (نیشنل کال۔ ۹/۳۸ ۱۲)

ڈاکٹر بی۔ پتابھی۔ سیتا رامیا۔ کانگرس کی مجلس عاملہ کے ایک رکن نے سودیشی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارا معاشرتی نظام جو ہزاروں برس ہوئے وجود میں آیا تھا اسکی رُو سے افلاس کا ناطہ علم اور عظمت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا لیکن اب زندگی کی متضاد قوتوں میں توازن پیدا ہو چکا ہے۔ اشتراکیت (کمیونزم) اور اشتمالیت (سوشلزم) دورِ حاضرہ کے نظریۂ حیات ہیں۔ اور ہندوازم اور اسلام ازم عہدِ کہن کی یادگاریں ہیں ہمیں چاہیئے کہ ہم اُنکی بُنیادوں کا از سرِ نو امتحان کریں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۹/۳۸ ۱۹)

مذہب چونکہ متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر میں ایک سنگِ راہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلیئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ جب تک ایک متحدہ مذہب وجود میں نہ آئے مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے اور اسے سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے۔ چنانچہ کانگرس کے صدر مسٹر بوس نے آسام میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ "میں سب کچھ مسلمانوں کے حوالہ کر دینے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ متحدہ قومیت کے نظریہ کو تسلیم کر لیں"۔ اسکی وضاحت میں ٹریبون نے اپنے ۱۷ جون ۱۹۳۸ء کے پرچے کے افتتاحیہ میں لکھا۔

"بس اس ایک شرط کے ماتحت طول و عرضِ ملک میں کوئی ایک کانگرسی بھی ایسا نہ ہوگا جو تمام اختیارات مسلمانوں کے حوالہ کر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اُنکے (یعنی کانگرسیوں کے) نزدیک یہ مسئلہ ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتا کہ کانگرس یا حکومت کے دائرہ میں زمامِ حکومت جسکے ہاتھ میں ہے وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ کیونکہ اُنکے نظریہ کی رُو سے مذہب

کو سیاسیات سے نہ کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی ہونا چاہیے"۔
اور ایک مسلم قومیت پرست اسی نظریہ کو ان الفاظ میں دُہراتا ہے:۔
"لیکن ان کا (مسلمانوں کا) باہمی اختلاف جو زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دُور نہیں ہو سکتا اور اگر اسکے دُور کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کسی ایسے ادارے میں شریک ہو جائیں جو مذہبیات سے بالکل علیحدہ اور صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہو اور ایسا ادارہ صرف کانگرس ہے"۔ (مدینہ ۔ ۱۳ اگست ۱۹۳۸ء)
ایک صاحب نے کہیں یہ اعتراض کیا کہ جواہرلال اور گاندھی مسلمانوں کے لیڈر کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسکے جواب میں ایک مسلمان کانگرسی اخبار نے لکھا کہ۔
"اگر لیڈری سے مُراد مسلمانوں کی دینی امامت و قیادت ہے تو یہ اعتراض دُرست ہے لیکن اگر اس سے مُراد سیاسی رہنمائی ہے تو بے شک وہ قائد و امام ہو سکتے ہیں" (زمزم ۱۵/۶/۳۸)
واردھا کی تعلیمی اسکیم کے متعلق جب اعتراض کیا گیا کہ اسمیں مذہبی تعلیم کا عنصر موجود نہیں۔ تو اُسکے جواب میں کانگرس کا آرگن نیشنل ہیرلڈ اپنی ۳/۱۲ کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔
"مذہبی تعصب کو یہ چیز فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اس مُلک میں جہاں اتنے مختلف عقائد موجود ہیں۔ قومی تعلیم کو مفید بنانے کی یہی تجویز ہو سکتی ہے کہ اُسے قرآن یا شاستروں کے قوانین اور احکام سے نہ لادا جائے"۔
متحدہ قومیت کے علمبردار ایک ایسے مذہب کو جو جماعتی زندگی سکھاتا ہو کس قدر خطرناک سمجھتے ہیں اسکا کچھ اندازہ پنڈت جواہرلال نہرو کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے۔ وہ اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں
"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ

حقوق اور مستقل حقوق کی بقا کا حامی ہے" (اسیری کی کہانی ۔ صلا)
لہٰذا متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ مذہب اس قسم کا بنا دیا جائے جیسا دینِ الٰہی یا برہمو سماج جس کی داغ بیل اکبر نے ڈالی تھی۔ اور جس کی تشریح مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں کی ہے اور جب تک ایسا مذہب تیار نہ ہو سکے، اسوقت تک مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے جسے دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔

عنصر سوم۔ آج مسلمان اپنا نام من حیث الجماعت الگ رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ یہ افتراق و اختلاف بھی متحدہ قومیت کی تعمیر میں سخت حائل ہے۔ لہٰذا قومیت متحدہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ قوم کا نام بھی ایک ہو۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب اپنے محولہ بالا مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"لفظ ہندی کو زبان کے لیے نہیں بلکہ اہلِ ہند کے لیے اختیار کرنا چاہیئے دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ملک ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں صرف اسکا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ دار بنجاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برّاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں اس لیے وقت آگیا ہے کہ ہم ایک مشترک نام اختیار کریں"

یہ اسلیئے کہ جیسا کہ ہم مسٹر کے۔ ایم۔ منشی کی تقریر کے اقتباس سے واضح کر چکے ہیں۔ وطنیت اور متحدہ قومیت کا رشتہ مذہب کے رشتہ سے کہیں بلند و بالاتر ہے۔ اسلیئے نام کا انتساب بالاتر رشتہ کی بنا پر ہونا چاہیئے لہٰذا متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہوئی کہ مسلمانوں کا اپنا الگ اسلامی نام بھی نہ رہے

عنصر چہارم۔ متحدہ قومیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس قوم کی زبان بھی ایک ہو۔ اسلیئے کہ جب تک کسی قوم کی زبان مختلف ہوتی ہے وہ دوسری قوم کے اندر جذب نہیں ہو سکتی اور بغیر انجذاب و انضمام متحدہ قومیت کا وجود عمل میں نہیں آسکتا۔ الگ زبان کے وجود کے بقا کی تمنا کرنا فرقہ پرستی ہے جو قومیت پرستی کے بالکل متضاد جذبہ ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے اور اِس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ اپنا اثر برابر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشو و نما کے ساتھ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائیگی' ایک علیحدگی پسند حامیٔ زبان کو اوپر سے کھرچو تو دیکھو گے کہ وہ اندر سے فرقہ پرست ہے۔ بلکہ زیادہ تر تم اُسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے"۔

عنصر پنجم۔ جب تک مسلمان اپنے مذہب کے پابند ہیں اُنکے باہمی معاملات کا تصفیہ ازروئے کتاب و سنت صرف مسلمانوں کی جماعت۔ اُنکی اپنی مجلس شوریٰ اور اُس مجلس کا امیر۔ مرکزِ ملت۔ ہی کر سکتا ہے لیکن یہ اصول متحدہ قومیت کی تشکیل کے منافی ہے۔ متحدہ قومیت میں تمام معاملات کا فیصلہ ایک ایسی جمہوری حکومت کیطرف سے ہوگا جو تمام مختلف مذاہب کے مشترکہ مجموعہ پر مشتمل ہوگی۔ اور جمہوریت کے اصول کے مطابق اکثریت کا فیصلہ مُلک کا قانون بنا کرے گا۔ اور اِس جمہوریت کی بنا ہوگی۔ خالص وطنیت۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کانگرس پارٹی کے لیڈر فرماتے ہیں:۔

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اِس امر کا اعتراف کریں۔ اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو اُنکے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور اُنہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اِس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم ہو سکتا ہے .... عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اِس نظریے پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک مُلک ہو اور اِس مُلک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں"

(ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ۹/۵/۳۸)

یہ نظریہ ایک ہندو کا ہی نہیں بلکہ خود مولانا حسین احمد صاحب کا بھی ارشاد ہے کہ :۔

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی۔ پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے"

(زمزم ۷ر جولائی ۱۹۳۸ء)

اس جمہوریت میں اقلیت کی کیا حالت ہوگی۔ یہ جنگِ آزادی کے قائدِ اعظم کی زبان سے سنیئے :۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے" (میری کہانی از پنڈت جواہر لال صفحہ ۵۵۴ جلد دوم)

لہٰذا متحدہ قومیت کی تعمیر کا پانچواں رکن یہ ہوا کہ اس میں نظامِ حکومت ایسی جمہوریت پر قائم ہوگا جو مسلم و غیر مسلم کی جماعتوں پر مشتمل ہوگی اور جس میں اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے۔

یہ ہے مختصراً متحدہ قومیت کا تصور اور اسکے عناصر ترکیبی۔ اسکے برعکس اگر مسلمان چاہیں کہ من حیث المسلم اپنا الگ جماعتی تشخص قائم رکھیں تو یہ جذبہ فرقہ پرستی کا وہ شجرِ ملعونہ ہے جو متحدہ قومیت کی جنت ارضی میں کسی صورت میں بارآور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال فرماتے ہیں :۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں منتشر ہے مبہم ہے۔ اور غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے ...... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے"

(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۱۳۳)

پھر فرماتے ہیں :۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے اگر اخبارات

اِس کی اسقدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اِس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اسپر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اِسکا خاتمہ ہوجاتا"

(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۲)

کس قدر تاسف سے لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اِس طور پر کرتے ہیں، گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دُنیا میں اِس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں"

(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۱)

خود مولانا صاحب اِس خیال کی تائید اِن حقیقت کُشا الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"ہندو مہاسبھا ویسے ہی ہندؤں کی الگ جماعت ہے جیسے مسلم لیگ مسلمانوں کی۔ کانگرس ہندوستان میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی جماعت ہے۔" (زمزم، جولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بھی پنڈت جی کی طرح مسلمانوں کی الگ جماعت کا وجود نہایت قابلِ نفرت چیز ہے اور قابلِ فخر جماعت وہی ہے جو ہندؤں اور مسلمانوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی بنیاد پر استوار ہو۔

تجزیہ
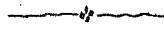
تفصیلاتِ بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہونے ضروری ہیں۔ چند الفاظ میں یوں سمجھیے کہ متحدہ قومیت میں:۔

(۱) مختلف قوموں کی تہذیب کو مٹا کر اُسے ایک جدید تہذیب میں منتقل کر دیا جائے گا۔

(۲) مختلف جماعتوں کے جُداگانہ مذاہب کی تحلیل سے ایک مرکب مذہب تیار کیا جائے گا اور جب تک وہ تیار نہ ہوگا۔ اُسوقت تک مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ سمجھا جائے گا۔

(۳) مختلف قوموں کا الگ الگ نام بھی باقی نہ رہے گا۔ بلکہ ایک مشترکہ نام بنابر وطنیت اختیار

کیا جائے گا۔

(۴) مختلف جماعتوں کی زبان بھی جُداگانہ نہیں ہوگی بلکہ اکثریت کی زبان متحدہ زبان قرار پائیگی

(۵) متحدہ قومیت کا نظام ایک ایسی جمہوریت سے مرتب ہوگا جو تمام اقوام کے امتزاج سے قائم ہوگا۔ اور جس کی رُو سے اکثریت کے فیصلے مُلک کا قانون بنا کریں گے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

متحدہ قومیت میں مُسلمانوں کو اپنا الگ قومی تشخص (National Identity) قائم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

لہٰذا

متحدہ قومیت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک مُلک میں بسنے والی مختلف قوموں کو بنا بر وطنیت اِس طرح آپس میں ملایا جائے کہ انکی جُداگانہ تہذیب۔ تمدّن، نام، زبان۔ مذہب باقی نہ رہے۔ بلکہ انکے امتزاج سے ایک مشترکہ اور متحدہ تہذیب۔ تمدّن، نام۔ زبان اور مذہب کا وجود عمل میں لایا جائے اور وہ سب ملکر ایک ایسے دستورالعمل کے ماتحت زندگی بسر کریں جسے اس متحدہ قومیت کی جمہوری حکومت چلائے

یہ نظام کس طرح قائم کیا جایگا اسکی تفصیل بھی پنڈت جواہرلال نہرو کی زبان سے سُن لیجئے فرماتے ہیں:-

"سوسائٹی کی موجودہ کش مکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں اِس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہوجائے اسوقت تک نظامِ تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہوسکے گی۔ لیکن اسکے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی"۔ (میری کہانی ص ۶۹-۳)

معانی متعین ہوگئے۔ ارباب نظر کے لیے تو اسکی شاید ہی ضرورت ہو کہ اب دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کی متحدہ قومیت کشتیٔ اُمت کو اپنے ہاتھوں آنند بھون کے سامنے گنگا میں

ڈبو دینے کے مُرادف ہے۔ لیکن چونکہ مولانا صاحب اِس متحدہ قومیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسکی تشکیل مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور (معاذ اللہ) اسکی بُنیاد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ اِسلیئے آئندہ صفحات میں واضح کیا جائیگا کہ فی الواقعہ عجم ہنوز رموزِ دیں نمی داند۔ پہلے مولانا صاحب کے دلائل پیش کیئے جائینگے۔

باب سوم

متحدہ قومیت اور اسلام

مولانا صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات میں سب سے پہلے یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مختلف انبیاء کرام کی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِن قوموں میں مومن و کافر دونوں شامل تھے لہذا اِس سے ثابت ہوا کہ مومنین و کافرین کے امتزاج سے متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لفظ قوم کی بحث کے دَوران میں ارشاد ہے کہ :-

"جس جگہ (یہ لفظ) مضاف واقع ہوا ہے اور مضاف الیہ مسلمان یا پیغمبر ہے اور کلام غیر مسلم کے متعلق ہے تو یقیناً اس جگہ پر مشرکوں اور کفار کا پیغمبر یا مسلمانوں کے ساتھ قومیت متحدہ میں منسلک ہونا ہی مفہوم ہوتا ہے۔ کذبت قوم نوح المرسلین۔ کذبت قبلھم قوم نوح و اصحاب الرس .... الخ" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۱۸)

اسی قسم کی اضافتوں کی مثالوں کے بعد فرماتے ہیں :-

"غرضیکہ اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں غیر مسلموں کو اور پیغمبر کو ایک قوم بتایا گیا ہے اور اِن کفار کو پیغمبر کیطرف بوجہ اتحاد نسب یا اتحاد وطن وغیرہ نسبت کیا گیا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۱۹)

چنانچہ خود نبی اکرم صلعم کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

"بارگاہِ الٰہی سے جنابِ رسول اللہ صلعم اور دوسرے پیغمبروں کو بعد تقرر دین و شریعت کہا

جاتا ہے۔

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ۔ الآیہ

"کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ پر عمل کرو۔ میں اپنی جگہ پر عمل کرتا ہوں"

اسکے بعد ان آیات سے حسب ذیل نتائج مستنبط فرماتے ہیں۔

"الغرض یہ آیتیں صاف طور سے واضح کر رہی ہیں کہ:-

(الف) قرآن کے نقطۂ نظر اور استعمال میں لفظ قوم اپنے معنی کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ ہر اس جماعت پر بولا جائیگا جن میں کوئی رابطہ ہو خواہ نسب کا یا وطن کا۔ یا پیشہ یا زبان کا۔

(ب) قومیت میں اشتراک مسلم و کافر ہو سکتا ہے اور قرآن کے استعمال میں یہ موجود ہے

(ج) پیغمبر بھی اتحادِ قومیت میں کافر و مشرک اور فاسق کے ساتھ دنیا میں تعلق رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۲۲)

ہمارا خیال ہے کہ اس دلیل کو پڑھ کر آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہوگی کہ حضرت علامہ کیوں بلک بلک کر روتے تھے۔ اور ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کیوں خون کے آنسو بہاتے تھے جس قوم کے سب سے بڑے دار العلوم کے سب سے بڑے عالم کی قرآن فہمی کی یہ حالت ہو اُس قوم کے مستقبل کا خدا حافظ۔ یہی وہ احساس درد انگیز تھا جس کی بنا پر حضرت علامہ کا جگر شق ہو جاتا تھا اور ہجوم غم و فورِ الم کبھی سیلابِ اشک بنکر اُمنڈ آتا اور کبھی یک آہِ سحرگاہی کی صورت میں "بحضورِ حق" یوں نالہ کش ہوتا کہ:-

بآں قومے از تو میخواہم کشادے
فقیہش بے یقینے، کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من !
"مرا اے کاشکے مادر نہ زادے"[1]

۱؎ ارمغانِ حجاز ۱۲

اسمیں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے مختلف انبیاء کرامؑ کے نام سے ان اقوام کو منسوب کیا ہے جو ان کے پیغامات کی اولیں مخاطب تہیں لیکن اس انتساب سے مقصد محض تعارف تہا (جعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ہم نے تمہارے قبیلے اور خاندان اسلیئے بنایئے کہ تم پہچانے جاؤ) مثلاً حضرت نوح جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اس قوم کے متعلق قرآن کریم میں جہاں کچھ ذکر آئے گا تو لامحالہ اُسے قوم نوحؑ ہی کہنا پڑیگا۔ اِسکے علاوہ اس قوم کے ذکر کرنے کا اور کون ساطریقہ النسب ہو سکتا ہے کیونکہ اس قوم کا کوئی دوسرا نام ہی نہ تہا لیکن اِس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اس قوم کے کُفر و مومن ملکر ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک ہوجاتے تھے"! نبی کی بعثت کے وقت ایک قوم موجود ہوتی تہی کبہی اُسے اس نبی کی قوم کہہ دیا جاتا۔ اگر وہ کسی اور نام سے منسوب ہوتی تو وہ نام لے دیا جاتا مثلاً قوم عاد، قوم ثمود کبھی اسے اُسکے کسی سردار کی طرف منسوب کردیا جاتا۔ جیسے قوم فرعون پھر اس قوم میں سے ایک جماعت ایمان لے آتی۔ اُن کی اِس وحدتِ تخیل۔ اور وحدتِ عمل کی بنا پر اُنہیں دوسرے لوگوں سے متمیز کرکے مومنین کی جماعت کہا جاتا جو اُس قوم میں سے انکار و تکذیب کرتے انہیں کُفار کی جماعت کہا جاتا۔ قرآن کریم میں جہاں مختلف انبیاء کرامؑ کے نام سے مختلف قومیں منسوب ہیں۔ وہاں اُن قوموں میں سے ۲ دُو مختلف جماعتوں کا ذکر الگ الگ موجود ہے۔ اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ متحدہ قومیت میں کسی الگ جماعت کا ذکر یا نام یا تشخص۔ یا جُدا گانہ قومی وجود اصولِ قومیت کے خلاف ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ہر دو جُداگانہ جماعتوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے اور انکا الگ الگ انجام کیا ہوا کرتا تہا۔ متحدہ قومیت میں اتنی بات تو ظاہر ہے کہ اگر ڈوبے گی تو تمام قوم ڈوبے گی۔ اگر ابھرے گی تو ساری کی ساری قوم ابھرے گی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس متحدہ قوم کا ایک حصّہ سرفرازی و سربلندی۔ عزّت و وقار۔ جاہ و حشمت۔ سطوت و حکومت کی زندگی بسر کرے۔ اور کوئی دوسرا حصّہ ذلّت و مسکنت، تباہی بربادی افلاس و نکبت کے ہولناک عذاب میں مبتلا ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن اقوام کو مولانا صاحب انبیائے سابقہ کی متحدہ اقوام اقرار دیتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی تہی کہ انہیں سے ایک جماعت (مومنین) کامیاب و کامران ہوتی۔ اور دوسری جماعت (کافرین) تباہی و بربادی کے جہنم میں دھکیل دی جاتی۔ سارا

قرآن کریم اسی قسم کے نظائر سے بھرا پڑا ہے اور ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تمام تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ کفر و ایمان کے نتائج میں بیّن فرق کر کے بتا دے۔ ہم یہاں صرف ایک سورت (ہود) کی چند آیات پیش کرتے ہیں۔ رکوع دوم کے اخیر دو قسم کی جماعتوں کا ذکر ہے ایک تو وہ جسکے متعلق ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ... (۱۱/۲۳-ایمان والوں کی جماعت) دوسری وہ جسکے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ (۱۱/۲۱ کفار کی جماعت) پھر اُن کا باہمی موازنہ ان الفاظ میں فرمایا۔ کہ ان کی شناخت میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

مَثَلُ الۡفَرِیۡقَیۡنِ کَالۡاَعۡمٰی وَالۡاَصَمِّ وَالۡبَصِیۡرِ وَالسَّمِیۡعِ ؕ ہَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ مَثَلًا (۱۱/۲۴)

اِن ہر دو جماعتوں (فرقوں) کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے اور سننے والے کی مثال ہے کیا یہ کبھی دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

قرآن کریم نے یہاں لفظ بھی فریقین استعمال کیا ہے جو آپکی دورِ حاضرہ کی سیاست میں (Communities) کا ترجمہ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے Communalism یعنی فرقہ پرستی کہا جاتا ہے جو متحدہ قومیت کی بالکل ضد ہے۔

اس تمہید کے بعد تیسرے رکوع سے اُمم سابقہ کے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی قوم کے تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ ۔ (۱۱/۲۵)

اور یقیناً ہم نے نوحؑ کو اُسکی قوم کی طرف بھیجا۔

ایک قوم تھی جس کی طرف حضرت نوحؑ کو بھیجا۔ اسکے بعد اس قوم کے مومنین اور منکرین کا ذکر ہے منکرین کی سرکشی اور بغاوت کا بیان ہے کشتی اور طوفان کا تذکرہ ہے۔ اخیر میں اس قوم کے دو فریقوں کو بالکل الگ کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ ایک وہ جو نذرِ طوفان ہو گیا۔ دوسرا وہ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ محفوظ و مصون زندہ رہا جسکے متعلق ارشاد ہے:۔

قِیۡلَ یٰنُوۡحُ اہۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَکٰتٍ عَلَیۡکَ وَعَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَکَ (۱۱/۴۸)

کہا گیا اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اُترو۔ اور تجھ پر اور جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں اُن پر برکات ہوں

فرمایا یہ ایک قسم کی متحدہ قومیت تھی جس کی دو جماعتوں میں تفریق ہوئی۔ پھر چوتھے رکوع میں حضرت ہودؑ کی قوم عاد کا ذکر ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ ...... (۵۰/۱۱)

اور عاد کی طرف انکا بھائی ہود بھیجا جسنے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبودیت اختیار کرو

پھر اس قوم کے کفار اور مومنین کی الگ الگ جماعتوں کا ذکر ہے اور انجام کار بتایا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں پر تباہی اور بربادی کا عذاب نازل ہوا اور مومنین کی جماعت کے متعلق ارشاد ہوا

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ...... (۵۸/۱۱)

اور جب ہمارا حکم آپہونچا تو ہم نے ہودؑ کو اور اُن لوگوں کو جو اسکے ساتھ ایمان لاچکے تھے اپنی رحمت سے بچالیا۔

چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ کی قوم ثمود کا ذکر شروع ہوتا ہے (۱۱/۶) اور اس قوم کی سرکش اور فرمانبردار جماعتوں کی تفریق کے بعد قوم مومنین کے متعلق انہی الفاظ کا اعادہ ہوتا ہے جو مذکورہ صدر آیت میں مندرج ہیں

ساتویں رکوع میں قوم لوطؑ کا ذکر ہے۔ اس قوم کو بھی انہی دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے منکرین پر عذاب نازل ہوتا ہے اور مومنین کی جماعت حضرت لوطؑ کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی ہے (۱۱/۸)

آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ کی قوم مدین کا ذکر ہے اور انکی حسب صدر تفریق کے بعد قوم مومنین کے متعلق آیت مندرجہ بالا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ (۱۱/۹)

پھر حضرت موسیٰ کی قوم اور فرعون کی تباہی کا ذکر ہے اور ان انبیا کرام اور انکی اقوام کی مومن و کافر جماعتوں کے انجام کے تذکرہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے سامنے بھی اس قوم مخاطب کے دو گروہ ہیں ایک تو مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيَكْفُرُ بِالطَّاغُوتِ والا (جماعت مومنین) اور دوسرا مَنْ يَكْفُرُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ بِالطَّاغُوتِ والا (جماعت کفار) اور اس دوسری جماعت کے متعلق فرمایا:-

وَقُلْ لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ (۱۱/۱۲)

اور اس کفار کی جماعت سے کہہ دیجئے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کیے جاتے ہیں

وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ○ ۱۱/۱۲۲

تم بھی (انجام کا) انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں!

آپ ان حقائق قرآنی کو سامنے رکھیئے اور پھر اپنی بصیرت سے فتویٰ طلب فرمایئے۔ کہ کیا ان سے واقعی متحدہ قومیت کے دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے یا اس بات کا کہ وہ لوگ جو نبی پر ایمان لاتے تھے اور اسکی اتباع کرتے تھے۔ وہ ایک الگ جماعت کے افراد ہوتے تھے (جنہیں اِنَّا یعنی ہم کہا گیا ہے) اور دوسرے لوگ الگ گروہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ (جنہیں کُمْ یعنی تم کہہ کر پکارا گیا ہے) اب یہ ظاہر ہے کہ "ہم" اور "تم" کی تفریق سیاستِ حاضرہ کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہلاتی ہے۔ اور متحدہ قومیت کی تشکیل اُس وقت ہوتی ہے، جب "ہم" اور "تم" کا امتیاز یوں مٹ جائے کہ:-

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اِن ہر دو مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے۔ کیا حضرات انبیاء کرام اور اُنکے متبعین کی جماعت کفار کی جماعت کے ساتھ یوں گھل مل کر رہتی تھی۔ کہ اُن کی تہذیب ایک ہو جائے۔ تمدن ایک ہو جائے۔ نظریاتِ زندگی ایک ہو جائیں۔ یا مومنین کی جماعت کفار کی جماعت سے برأت اور بیزاری علیحدگی اور قطع تعلق کا اعلان فرمایا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ خدا نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ کفار کی تباہی کے اوپر افسوس بھی نہ کرو۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (المائدہ)

قوم کفار کی بربادی (پر تاسف بھی نہ کرو!

بلکہ اُن کی تباہی اور بربادی پر تو خوشی اور مسرت کے سجدہ ہائے شکر ادا کرنے کا حکم ہے کہ جسدِ انسانی سے اِس مادۂ فاسدہ کا نکلنا عین صحت ہے۔ فرمایا:-

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (انعام)

پھر اِن ظالمین کی جڑیں کٹ گئیں۔ سو اللہ رب العالمین کے لیے سب تعریف ہے۔

ملّتِ حنیفہ کے مؤسسِ اوّل حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور اُنکے ساتھیوں کی حیاتِ طیبہ کو قرآنِ کریم نے مؤمنین کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے غور فرمایئے کہ اس باب میں اُنکا مسلک کیا تھا۔ اور قرآنِ کریم نے کس مقام پر اُنکے طرزِ عمل کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ

یقیناً تمہارے لیے ابراہیم اور اُسکے ساتھیوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جو کچھ تم اللہ کے سوا پوجتے ہو اُن سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں ہم تمہارے منکر ہیں۔ اور ہم میں تم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور بُغض ظاہر ہے جبتک کہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ

دیکھیے "اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" ایک جماعت کا نام ہے اور "قَوْمِھِمْ" ایک دوسری جماعت ہے اور ان دونوں میں بُغض اور عداوت ظاہر ہے۔ تا وقتیکہ کُفّار کی جماعت ایمان نہ لے آئے۔ فرمایئے یہ بُغض اور عداوت کے تعلقات متحدہ قومیت ہی کا ثبوت دیتے ہیں یا متحدہ قومیت کے لیے حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ کی شرط بھی ضروری ہے۔ ذرا آج ہندوں سے کہیئے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغض و عداوت رہیگی۔ تا وقتیکہ تم ایمان نہ لے آؤ پھر دیکھیے کہ وہ آپکو کس طرح متحدہ قومیت کا جزو تسلیم کرتے ہیں یا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے اُسوۂ حسنہ کی اتباع میں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ پر عمل نہیں صرف اس کا اعلان ہی کر دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ یہ بڑے بڑے وسیع الظرف قومیت پرستی کے اوتار جناب کی نسبت کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

مولانا صاحب قومِ نوحؑ "قومِ موسیٰ" وغیرہ کی مثالوں سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کر سکتے تھے کہ کُفّار اور مؤمنین کی جماعتوں کو ایک مشترکہ نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہوگی کہ اُمتِ مُحمّدیہؐ کی نسبت اس نتیجہ سے بھی کچھ فائدہ نہ اُٹھایا جا سکے گا۔ اسلیئے کہ جنکے متعلق خود اللہ تعالےٰ نے کہہ دیا ہو کہ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اُسنے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ کسی کو کیا حق پہونچتا ہے کہ اُس قوم کا نام بھی کچھ

اور رکھ سکے"۔

یہ تھی متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب کی پہلی دلیل۔

دوسری دلیل

متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب نے دوسری دلیل اُسوۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش کی ہے، فرماتے ہیں:۔

"جناب رسول اللہ صلے نے اپنی رسالت کے چودہ برس گزر جانے کے بعد مدینہ منورہ میں وہاں کے اور اپنے ساتھ کے مہاجرہ انصار مسلمانوں اور مدینہ کے یہودیوں کو ملا کر ایک متحدہ قوم اور متحدہ اُمت بنائی اور نہایت مفصل عہدنامہ اس امر کے متعلق تحریر فرمایا اور اس میں تحریر کر دیا گیا کہ مشروطات مذکورہ امور میں دشمنوں کے مقابل مسلمان اور یہود ایک اُمّتِ متحدہ ہونگے مگر ہر ایک اپنے اپنے مذہب کا پابند ہوگا (متحدہ قومیت اور اسلام صہ ۳۴)

اسکے بعد مولانا صاحب نے اُس "معاهدہ" کا ذکر فرمایا ہے جو مسلمانوں اور یہودیوں کی "متحدہ قومیت" کے مابین ہوا تھا۔

بات یوں تھی کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی رہتے تھے مدینہ منورہ کی محافظت کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی تھی۔ اسلیئے حضور صلعم نے مسلمانوں کی جماعت اور یہودیوں کی جماعت کے درمیان ایک معاہدہ کیا جسکی رُو سے قرار پایا کہ اگر کوئی دشمن باہر سے حملہ آور ہوگا تو دونوں معاہد جماعتیں متحدہ طور پر اُس کی مدافعت کرینگی۔ اس سے مولانا صاحب استنباط فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلعم نے مسلمانوں اور یہودیوں کو ملا کر ایک قوم بنا کر متحدہ قومیت کی تشکیل فرمائی تھی۔ (رسالہ مذکور صفحہ ۳۹)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

مولانا صاحب نے اس دلیل کو یہاں پہلی مرتبہ ہی نہیں پیش کیا۔ بلکہ وہ اکثر اپنی تقریروں میں بھی دُہراتے رہتے ہیں اور بزعم خویش سمجھ لیتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے ثبوت میں اس محکم دلیل اور

عروۃ الوثقیٰ کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ وہ اگر کبھی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔ تو انپر شاید یہ حقیقت واضح ہو جائے۔ کہ یہ واقعہ تو انکے دعوے کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ بات ایک "ابجد خواں" بھی جانتا ہے کہ معاہدہ ہمیشہ دو مختلف اقوام میں ہوا کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں کا اور وہاں کے یہودیوں کا وطن ایک تھا۔ اب اگر متحدہ قومیت کی تعمیر کے لیے اشتراکِ وطن ہی ایک شرط ہو تو مدینہ کے مسلمان اور یہود تو اِس اعتبار سے خودبخود ایک متحدہ قوم ہونے چاہئیں اِس متحدہ قوم میں "معاہدہ"! خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے۔ اِس معاہدہ کا تو وجود ہی اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان ایک ملک بلکہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مکّہ کے مسلمان اور مدینہ کے مسلمان بلکہ حبش اور روم اور فارس کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہونگے لیکن مدینہ کے مسلمان اور مدینہ کے یہود ایک قوم نہیں بن سکیں گے۔ ان میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے معاہدہ کی ضرورت پڑے گی۔ نبی اکرمؐ نے یہود اور مسلمانوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کی تعمیر نہیں کی تھی۔ بلکہ اُس معاہدہ کی رُو سے دو مختلف اقوام میں باہمی اشتراکِ عمل اور اتحادِ محاذ کی شکل پیدا کی تھی۔ اور یہ وہ شکل تھی جسے قرآن کریم بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ سے تعبیر کرتا ہے۔ غور فرمائیے اِس آیۂ مقدسہ میں ایک چیز ہے کُمْ (تم) اور دوسری چیز ہے هُمْ (وہ یعنی غیر مسلم) اور اِن دونوں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہے میثاق۔ متحدہ قومیت کو چھوڑیئے اِسکا تو تصور ہی یکسر غیر قرآنی ہے۔ کفر و اسلام، مومن و کافر کا باہمدگر یوں مل جانا کہ انہیں آپس میں کسی معاہدہ کی ضرورت نہ رہے۔ تلبیس حق و باطل کی ایسی خوفناک مثال ہے کہ جس سے روح کانپ اُٹھتی ہے اسلام کی رُو سے تو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہی میثاق کی ضرورت ہے جس کے بغیر وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ اور اشتراکِ عمل بھی صرف ان امور میں کر سکیں گے جو اُس معاہدہ میں "مشروط مذکور" ہوں گے۔ اب ذرا یہ فرمائیے کہ جس طرح نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ معاہدہ کر کے اتحاد پیدا کیا تھا۔ آپ حضرات نے ہندوں کی جماعت کے ساتھ کون سا ایسا معاہدہ کیا ہے۔ معاہدہ کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے، وہ تو جیسا

پہلے لکھا ہے آپ کی جُداگانہ قومیت ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کی تحریروں کے اقتباسات آپ دیکھ چکے ہیں۔ وہ اسکا علانیہ تمسخر اُڑاتے ہیں اور ایک جواہرلال پر کیا موقوف ہر وہ شخص (ہندو ہو یا مسلمان) جو متحدہ قومیت کا حامی ہے وہ مسلمانوں کی جُدا قومیت کے دعوے کو مذہبی جنون سے تعبیر کرتا ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والوں کو ساحرین برطانیہ کے جادو کا مسحور بتاتا ہے۔ رجعت پسند کہتا ہے۔ اُسکا نام ٹوڈی رکھتا ہے یعنی وہ شخص جو ہندو مسلم اتحاد کے لیئے اس راہِ عمل کو اختیار کرتا ہے جو قرآن کریم نے تجویز فرمائی اور جسپر خود نبی اکرمؐ نے عمل کرکے دکھایا۔ وہ آج — ہندوؤں کی نگاہ ہیں نہیں بلکہ قومیت پرست مسلمانوں کی نگاہ ہیں — اور عام مسلمانوں کی نگاہ ہیں نہیں بلکہ کتاب و سنت کے علمبردار ہونے کے مُدعیوں کی نگاہ ہیں — مسلمانوں کا دشمن اور اِسلام سے غداری کرنیوالا ہے۔ اور جو اُس متحدہ قومیت کا مُدعی ہے۔ جو یورپ کی تنگ نظری کی ایجاد ہے جسے ہندو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ایسا درخشاں اور تابناک بناکر پیش کر رہا ہے اور جسکے ماننے سے قصرِ اسلام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، وہ شخص واقفِ اسرارِ دین ہے۔ سرفروش و جانباز مجاہد ہے ملتِ اسلامیہ کا بہترین نمائندہ ہے مسلمانوں کا صحیح ترجمان ہے۔ لہٰذا امام الہند ہے۔ امیر المومنین ہے۔ یا للعجب۔

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد   کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دَیرے بناکردند آنجا   پرستد مومن و کافر تراشد   (اقبالؔ)

کبھی یہ حضرات ہندوؤں سے الگ ہوکر بات سُنیں تو انہیں بتایا جائے کہ حضرت علامہؒ یا اُنکے ہم مسلک حضرات۔ جو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے مُدعی ہیں۔ وہ انگریز کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ محاذ قایم کرنے کے لیئے بالکل اسی طریق عمل کو اختیار کرنا چاہتے ہیں جو نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا یعنی مسلمانوں کی الگ جماعتی حیثیت کو تسلیم کراکر ہندوؤں کے ساتھ من حیث الجماعت ایک معاہدہ کیا جائے۔ اور اُس معاہدہ کی رُو سے ہندو مسلم اتحاد پیدا کرکے صحیح آزادی حاصل کی جائے۔ لیکن ہندو چونکہ مسلمانوں کی جُداگانہ جماعتی حیثیت کو فنا کردینے

کے منصوبے باندھ چکا ہے اِسلیئے وہ اسے تسلیم کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اور سادہ لوح مسلمان کو یہ کہکر اپنے زنّار کی لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ یہ مطالبہ ہندو مسلم متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک سخت روڑا ہے۔ اور انگریز کا پیدا کردہ ہے۔ اب مسلمان ہے کہ بلا سوچے سمجھے ہر جگہ یہی راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے۔ اور یوں حریفانِ کوشۂ آستیناں کا آلۂ کار بنکر اسی شاخ کو کاٹنے لگ جاتا ہے جس پر خود اس کا نشیمن ہے۔ چونکہ یہ مسلک ہندو کے مفاد کے عین مطابق ہے اس لئے وہ ایسے مسلمانوں کی بیحد تعریف کرتا ہے انہیں آزادئ وطن کا پرستار کہتا ہے ہر جگہ ان کا سواگت کرتا ہے ان کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھاتا ہے شری یت اور دیش بندھو کہکر ڈنڈوت کرتا ہے اور یوں ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں اپنی قومیت کی دیوار میں چنتا جاتا ہے۔ کسقدر صحیح کہا ہے اس مردِ حق آگاہ نے جسے فطرت کی کرم گستری نے بصیرت قرآنی اس قدر فراواں عطا فرمائی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را — نمی گوید بہ کس اسرارِ خود را

بمن گوید کہ از تسبیح بگذر — بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

(اقبالؔ)

باب چہارم

مسلم و غیر مسلم کے تعلقات

موالات قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ انسانوں کے باہمی تعلقات کو دو شعبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جسے وہ موالات کہتا ہے جس کے معنی ہیں قلبی تعلقات۔ ایک دوسرے پر کامل اعتماد۔ پورا پورا دلی بھروسہ۔ ایسے تعلقات جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہوں جن میں قلب کو اتنا اطمینان حاصل ہو کہ حاضر و غیب دوسرے پر کامل بھروسہ کیا جا سکے اور یہ یقین ہو کہ میرے تمام مفاد دوسرے کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ متحدہ قومیت میں اسی قسم کے تعلقات کا تقاضا ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے کسی مسلم کا غیر مسلم کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قایم کرنا جائز ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں موالات کے متعلق ارشاد ہے۔

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست (ولی) ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ برائی سے روکتے ہیں نماز پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ...... ۹/۷۱"

دوسری جگہ فرمایا:۔

"تمہارے دوست تو صرف اللہ اس کا رسول اور ایماندار لوگ ہیں۔ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان میں خشوع ہوتا ہے۔" ۵/۵۵

ان آیات میں حصر کے ساتھ بیان فرمایا کہ موالات کے تعلقات صرف مسلمانوں کے ساتھ پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ پھر اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ بھی بالتصریح فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہرگز ہرگز اس قسم کے تعلقات پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ ارشاد ہے۔

"اے ایمان والو۔ اپنوں کے سوا اور کسی کو دوست (ولی) مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنائیں رکھتے ہیں بعض (منصوبے) تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو تو۔ تم ان لوگوں سے محبت کرتے ہو مگر وہ کبھی تم سے محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں کو مانتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ جاؤ۔ اپنے غصے میں مر مٹو اللہ دلوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اگر تمہیں کوئی اچھی بات پہنچ جائے تو ان کے لئے موجب غم ہوتی ہے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم استقلال سے رہو۔ اور ان سے اپنی حفاظت کرتے رہو۔ تو ان لوگوں کی تدابیر تم کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ ان کے اعمال کو محیط ہے"۔ $\frac{3}{117-119}$

ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ آیات آج بھی قرآن کریم میں موجود ہیں یا (نعوذ باللہ) منسوخ ہو چکی ہیں اگر موجود ہیں تو کیا ہندوستان کا ہندو ان غیر مسلموں میں شامل ہے یا نہیں جن کی نفسیاتی کیفیت کا ذکر ان آیات میں موجود ہے۔ اور اگر ہندو ان میں شامل ہے تو کیا اس کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا کئے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی خود قرآن کریم سے سُن لیجئے۔ فرمایا۔

"جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں۔ جو اللہ اور رسول کے خلاف ہوں۔ گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی۔ یا کنبہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں"۔ $\frac{58}{22}$

یعنی وطن کا رشتہ تو ایک طرف یہاں تو خون کا رشتہ بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے کس قدر واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ غیر مسلم جب تک ایمان لاکر جماعت مومنین میں داخل نہ ہو جائیں ان کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس اعلان سے متصل یہ آیات بھی ملاحظہ ہوں۔ فرمایا۔

"اے ایمان والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تمہارے پاس جو کچھ حق کے ساتھ آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں۔ .... اگر ان کو تم پر دسترس حاصل ہو جائے تو (فوراً) تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور تم پر زبان اور ہاتھ سے مضرت رسانی پر اتر آئیں گے۔" (۶۰/۱–۲)

واضح رہے کہ ان اشاراتِ خداوندی میں کسی خاص زمانہ کسی خاص ملک یا کسی خاص قوم کے غیر مسلموں کا ذکر نہیں۔ بلکہ یہ تمام کفار کو محیط ہیں۔ قرآن کریم میں اس بات کی صراحت متعدد مقامات پر موجود ہے۔ جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو ہم اس کی تصریحات پیش کرنے کو بھی تیار ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو کفار کے موالات سے جو اتنی شدت سے روکا ہے تو اس کی وجہ بھی بیان فرما دی ہے کہ

ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء ۔ فلا تتخذوا منھم اولیاء ۴/۸۹

وہ لوگ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے خود ہیں اسی قسم کے تمہیں بنالیں۔ تاکہ تم اور وہ سب برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا۔

اس میں یہ ٹکڑا "فتکونون سواء" قابلِ غور ہے یعنی ان کی خواہش یہ ہے کہ وہ تم کو بھی اپنے جیسا بنالیں اور یوں تم سب برابر ہو جاؤ۔ ایک جیسے ہو جاؤ۔ ذرا غور کیجئے کیا متحدہ قومیت کی بنیاد ہی اس اصول پر نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان برابر ہو جائیں۔ ایک قوم بن جائیں۔ اقلیتیں اپنے امتیازی نشانات چھوڑ کر متحدہ قومیت کے اجزا بن جائیں۔ حالانکہ مسلمان کا امتیازی نشان ہی اس میں ہے کہ وہ صرف خدا کے رنگ میں رنگا ہو۔ صبغة اللہ ومن احسن من اللہ صبغة (اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے) اور یہ رنگ اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا وجود

قائم ہے۔ جب یہ امتیازی وجود مٹ جائے گا تو یہ رنگ بھی باقی نہیں رہے گا۔ غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔ فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ۸/۲۹

اے ایمان والو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمھیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔

یہ امتیاز مٹ گیا تو مسلمان بھی باقی نہ رہا۔ اور "فتکونون سواء" سے کفار کی خواہش ہی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ امتیاز مٹ جائے۔ اور اس کے مٹانے کے لئے آج ہندوستان میں سب سے بڑا حربہ متحدہ قومیت کا تصور ہے۔ جسے مولانا صاحب عین اسلامی شعار بتا رہے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ۔

در صد فتنہ را بر خود کشادی — دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست — تو قرآں را سرِ طاقے نہادی
(اقبال)

تعلقات کی دوسری قسم

تعلقات کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ باہمی عہد و پیمان کرے۔ معاہدہ اور میثاق کی رو سے مشروطہ مذکور معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کرے۔ یہ وہ طریق ہے جس کی قرآن کریم اجازت دیتا ہے۔ اور یہی وہ طریق ہے جس کی رو سے ہندؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی اتحاد نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ پیدا کیا تھا۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کفار اپنے عہد و پیمان پر بھی بہت کم پابند رہیں گے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان تو اس لئے معاہدہ کی پابندی ضروری سمجھتا ہے کہ یہ اس کے خدا کا حکم ہے۔ ایسا نہ کرنے سے وہ خدا کے ہاں مجرم قرار پائیگا۔ اس کے برعکس کفار معاہدہ کو محض ایک سیاسی چال سمجھتے ہیں۔ یونان کے ایک بہت بڑے مقنن، سولن کا یہ قول کسے یاد نہیں کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھنسا لیتا ہے لیکن اپنے سے طاقتور کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔" اور آج کون ہے جو سیاستِ عالم کا مطالعہ کرے اور اس مقولہ کی تصدیق نہ کرے۔ اسلئے قرآن کریم نے یہ بھی فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کے بعد آرام کی نیند نہ سو جاؤ بلکہ اپنی

جمعیت اور طاقت کو ہمیشہ برقرار رکھو کہ عہد بھی انہیں قوموں سے استوار رہتے ہیں جن میں طاقت موجود ہوتی ہے۔ مسلمان اس طاقت کو عہد شکنی میں۔ یا کمزوروں کو کچلنے میں صرف نہیں کرے گا۔ بلکہ اسے اس لئے برقرار رکھیگا کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اس کے بغیر ہر بالا دست قوت اسے ہڑپ کرنے کی فکر میں رہے گی۔ اسی لئے فرمایا

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ

بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ؕ

اور ان کے خلاف ہر ممکن قوت کے ساتھ اور پلے ہوئے گھوڑوں سے اپنے آپ کو تیار رکھو تاکہ اس سے اللہ کے اور تمہارے دشمن خوف کھائیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی۔

قومیت پرست حضرات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ فرض کیجئے ہم ہندوؤں کے ساتھ آج معاہدہ بھی کرلیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ معاہدہ کی پابندی ضرور کریں گے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کہ معاہدہ سے مطلب یہ نہیں کہ ایک کاغذ پر دستخط کرکے پھر بے فکر ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان میں مسلمان کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے۔ نو کروڑ نفوس اگر اپنے اندر اجتماعیت کا جذبہ پیدا کرکے ایک نظام اور ایک مرکز کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا تہیہ کرلیں تو ہندو تو ایک طرف انگریز کی بھی مجال نہیں کہ اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ اُس وقت دیکھیئے کہ معاہدوں کی توقیر کس طرح نہیں ہوتی۔ یہی تو وہ خطرہ ہے جس کے لئے ہندو مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس کے خلاف اُس نے متحدہ قومیت کا ایسا نظر فریب جال تیار کیا ہے کہ جس میں بڑے بڑے مرغ زیرک رشتہ برپا نظر آتے ہیں ورنہ کفار پر اعتماد۔ اُن سے دلی دوستی۔ اُن کے وعدوں کا اعتبار اُن سے یگانگت کے تعلقات مسلمانوں کی اجتماعی خودکشی کے مرادف ہے۔

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کیا ہے لیکن ہمارے قومیت پرست حضرات کی یہ عادت ہو چکی ہے۔ کہ وہ کسی ایسے شخص کی کوئی بات صحیح نہیں تسلیم کرتے جو

ان سے اختلاف رائے رکھتا ہو۔خواہ وہ قرآن ہی کیوں نہ پڑھکر سنائے۔اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس باب میں انہی میں سے ایک جلیل القدر ہستی کے خیالات پیش کر دیئے جائیں جنھیں وہ اپنے مسلک قومیت پرستی سے پہلے اپنی پوری شانِ خطابت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے واحد اسلامی راہِ عمل قرار دیا کرتے تھے۔ سُنئے اور غور سے سنئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو کاروانِ قومیت پرستی کے سرخیل ہیں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

مولینا آزاد کے ارشادات (مسلکِ قومیت پرستی سے پہلے)

"کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انھیں لحاظ تک نہیں۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا یہ اِدھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدّی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کفار سے مسلمانوں کو ساز و باز نہ رکھنا چاہیئے۔ اُن سے بے تعلقی لازم ہے۔ جو ساز و باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہے وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہو گی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرتِ کاملہ کوئی اور انتظام کریگی"

مضامین آزاد حصہ سوم

خدا معلوم وہ قرآن اب کہاں چلا گیا جو ان حضرات کو کفّار کے متعلق اس قسم کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اُس بصیرتِ ایقانی کو کن چیزوں کی چمک چکا چوند کر گئی جو ان حقایق کو بے نقاب دیکھا کرتی تھی۔ اُس جرأت

ایمانی کو کس کی نظر کھا گئی جو سینے کے پورے زور سے کفار سے برات و بیزاری کا اعلان کیا کرتی تھی وہ حرارتِ قلبی کون سی مصلحت کوشیوں کی برفانی سلوں کے نیچے دب گئی جو کفار کی سازشوں پر یوں مشتعل ہو جایا کرتی تھی۔ اُس قدرتِ کاملہ پر بے پناہ توکل کو کیا ہو گیا جو کبھی یہ تسکین دیا کرتا تھا کہ کفار کی کثرت سے گھبرا کر ان کے ساتھ تعلقات بڑھانے پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ اسلام کی کامیابی کیلئے خدا خود کوئی انتظام کر دے گا۔ اِسے قوم کی بدبختی نہ کہیئے تو اور کیا کہیئے کہ یہ حضرات جو کبھی اپنے صحیح اسلامی مسلک کی بناپر قوم کی نگاہوں میں ممتاز و مقدس قرار پا گئے تھے۔ اپنی اُس پوزیشن سے یوں ناجائز فائدہ اٹھا کر اب قوم کو اپنے ہاتھوں جہنّم میں دھکیل رہے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۱۴-۲۸-۲۹

کیا تم نے ان لوگوں کی طرف بھی دیکھا جنھوں نے کفرانِ نعمتِ الٰہی کیا اور یوں اپنی قوم کو جہنم میں دھکیل دیا۔ جس میں وہ داخل ہونگے اور جو بہت بری جگہ رہنے کی ہے

باب پنجم

متحدہ قومیت کے دعوے کے اثبات میں مولٰنا صاحب نے صرف یہی دو دلیلیں پیش کی ہیں جن کا جواب عرض کیا جا چکا ہے لیکن اُن کے رسالہ میں چند ایک باتیں اور بھی ایسی ہیں جو اُن کی غلط فہمیوں کی آئینہ دار ہیں اور جن کا ازالہ ضروری نظر آتا ہے۔ حضرتِ علامہؒ نے اس نظریہ کو پیش کیا تھا کہ اسلام قومیت کی بنا۔ اتحادِ رنگ۔ نسب۔ وطن۔ زبان۔ پر نہیں رکھتا بلکہ وہ قومیت کی بنیاد اُس بلند ترین اور عالمگیر تخیّل پر رکھتا ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اس کو مدیر احسان نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے"۔ متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۳۲

اِس کے متعلق مولینا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسا ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ

"تمام انسان اور ہر فرد بشر خواہ یہودی ہو خواہ عیسائی۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ سکھ ہو یا پارسی۔ بدھ ہو یا جینی۔ کالا ہو یا گورا۔ ایشیائک ہو یا افریقن (؟) سب کے سب ایک قوم ہو جائیں۔ کیونکہ شرفِ انسانی اور اخوت بشری سب میں پائی جاتی ہے۔ سب کے سب حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا کی اولاد ہیں اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ اور لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ .... الخ وغیرہ آیات (جو کہ شرف انسانی پر دلالت کرتی ہیں) کے مصداق ہیں۔ ہمارے علم میں کوئی آیت یا حدیث قومیت کی بنیاد ایسے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھنے والی موجود نہیں ہے"

ایضاً صفحہ ۴۳-۴۴

مشکل دراصل یوں واقع ہوئی ہے کہ حضرت علامہ ح نے اپنے بیان میں اسلامی قومیت کے متعلق جو اشارات ذکر فرمائے تھے۔ ان کا مخاطب قرآن فہم طبقہ تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ فریق مقابل کی قرآن کریم پر اتنی بھی نگاہ نہیں ہے تو وہ شاید اسے اپنی بلندی سے کچھ نیچے اتر کر لکھتے۔

مولانا صاحب کی دلیل کا صغریٰ کبریٰ یوں قایم ہوتا ہے۔

(۱) تمام بنی آدم جس صورت میں وہ آج موجود ہیں مشرف و مکرم ہیں۔

(۲) اور موجودہ انسانوں کی باہمی خوں ریزیاں اور تفرقہ انگیزیاں بالکل واضح ہیں۔

اس لئے

(۳) تمام انسان ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتے۔

مولانا صاحب کا الجھاؤ دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے تمام انسان جس صورت میں وہ آج موجود ہیں مشرف و مکرم ہیں لیکن اگر وہ اپنی نگاہ میں ذرا وسعت پیدا کرتے تو یہ مشکل نہایت آسانی سے حل ہو جاتی

انھوں نے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ سے یہ سمجھ لیا کہ تمام انسان شرف و اکرام میں برابر ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا اعجاز دیکھئے کہ اس نے اِسی سورت میں تمام مسئلے کو حل کر کے رکھ دیا سورۂ والتّین کی متعلقہ آیات یہ ہیں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ	ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ	پھر اُسے نچلے سے نچلے درجے میں گرا دیا
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	مگر اُن لوگوں کو نہیں جو ایمان لائے اور انہوں
فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔	نے اعمال صالحہ کئے اور اُن کیلئے غیر منقطع اجر ہیں

قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ فطرت انسانی نہایت عمدہ ہیئت پر پیدا کی گئی ہے (اَحْسَنِ تَقْوِیْم) لیکن انسان اس دنیا میں خارجی اثرات کے ماتحت اِس چشمۂ صافی کو جب مکدر کر لیتا ہے تو اُس کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ شرف و اکرام کے درجے سے نیچے گر جاتا ہے (اَسْفَلَ سٰفِلِیْن) لیکن جو انسان قرآن کریم کے متعین فرمودہ ایمان و اعمال صالحہ پر کاربند رہتے ہیں۔ وہ شرف انسانی کی صفت سے موصوف ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو شرف و اکرام سے نیچے گر گئے تھے اُن کے لئے شرف و اکرام کی سطح پر پھر سے آنیکا صرف ایک راستہ کھلا ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں داخل ہوجائیں تاکہ فطرتِ انسانی یوں اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائے۔ جتنے انسان یوں فطرت صحیحہ کو اختیار کرتے جائیں گے (جسے اسلام کہتے ہیں) وہ ایک قومیت کے شیرازہ میں منسلک ہوتے جائیں گے۔ اور یہ دائرہ رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے تمام عالم کو محیط ہو جائیگا۔ یہ ہے تفسیر حضرت علامہؒ کے اِن بصیرت افروز الفاظ کی۔

"الفاظ شرفِ انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہئے۔ اِسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو حضرتِ انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے یعنی یہ کہ اِس کی تقویم فطرت اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے۔ اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کے لیئے اُسکے رگ و ریشہ میں مرکوز ہے"۔

فرمائیے کہ کیا یہ سورۂ والتّین کی صحیح تفسیر نہیں ہے؟ لیکن مولانا صاحب ان الفاظ کو متعلق

ارشاد فرماتے ہیں کہ "ہمکو فیلسوفی الجھاؤ میں ڈالا جاتا ہے"۔ اور اس جرأت کے ساتھ کہ "ہم ان حقائق اور تخیلات کے متعلق کوئی تصدیق اور کوئی تکذیب کا کلمہ پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۴۳) استغفراللہ! مولانا صاحب نے یہ بھی نہیں سوچا کہ نشتر کی زد کہاں پہنچ رہی ہے۔ حضرت علامہؒ قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ واضح الفاظ میں بیان فرماتے ہیں اور مولانا کا ارشاد ہے کہ ہم اس کی تصدیق کے لیے تیار نہیں ہیں!
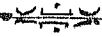
مولانا صاحب نے دوسری آیت وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ کی نقل کی ہے۔ لیکن اگر اُن کی نگاہیں قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر بھی ہوتیں تو اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو ہم نے سورۂ والتین کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ فطرتِ انسانی مکرم ہے لیکن ایک انسان صرف اُس وقت مکرم ہوتا ہے جب وہ اپنی فطرتِ صالحہ کو لئے ہوئے ہو۔ اور اس کا معیار تقویٰ جس کے متعلق فرمایا کہ

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اور تقویٰ نام ہے اُس قانون الٰہی کے تابع ہونے کا جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے قرآن کریم قومیتِ اسلامیہ کی بنیاد اسی پر رکھتا ہے۔ اور یہی حضرت علامہ کا ارشاد ہے۔ یعنی

"نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اُس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا"

یہ ہے حضور! مطلب اس فقرہ کا کہ اسلام نے قومیت کی بنا شرفِ انسانیت پر رکھی ہے۔ انسانیت کو شرف حاصل ہی اُس وقت ہوتا ہے جب وہ نبوّت محمدیہ کے تابع ہو کر شجرِ طیّب کی طرح بڑھے اور پھولے پھلے اور جو اس کے تابع نہ ہو وہ مشرف و مکرم تو ایک طرف انسانیت کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے۔

ان شر الدواب عند اللہ الذین کفروا فھم لا یومنون ۸/۵۵

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ انسان ہیں جو کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ا تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون۔ ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا
کیا تو خیال کرتا ہے کہ یہ لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ تو حیوانات کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ

پھر انسانیت میں صحیح اخوت بھی رشتۂ ایمان کی بنا پر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ (انما المومنون اخوۃ) یہ ہیں وہ حقایق جنہیں مولانا صاحب فلسفیانہ موشگافیاں اور شاعرانہ بلند خیالیاں قرار دیتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم اس کے سوائے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ ؛ ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ ؟ اقبالؔ

اسلام میں لچک نہیں ۔ حضرتِ علامہؒ نے اپنے بیان میں فرمایا تھا کہ

"مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا"

اس کے متعلق مولانا صاحب رقمطراز ہیں۔

"یہ خیال کہ اسلام بالکل غیر لچکدار مذہب ہے میری سمجھ سے باہر ہے میں جہاں تک اس کے قوانین کا تتبع کرتا ہوں وہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک ملک میں رہ سکتا ہے۔ ان کے ساتھ صلح کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ مواعدے کر سکتا ہے۔ ان کے تمام معاملات خرید و فروخت۔ شرکت و اجارہ۔ ہبہ و عاریت قرض و امانت وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا۔ شادی و غمی میں شریک ہونا۔ کھانا۔ پینا وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے۔۔۔ یہود و نصاریٰ کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتا ہے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۰ و ۵۱)

اس جواب کو پڑھئے اور پھر غور فرمائیے کہ ہم نے جو عرض کیا ہے کہ مولانا صاحب شاید سمجھے ہی نہیں کہ حضرت علامہؒ نے کیا لکھا تھا۔ وہ حرف حرف صحیح ہے یا نہیں۔ حضرت علامہؒ نے لکھا تھا کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ اصول جن پر اسلام نوعِ انسانی کی تشکیل ایک نظام اجتماعی میں کرنا چاہتا ہے وہ قوانین فطرت کی طرح اٹل اور بے لچک ہے۔ وہ اصول جیسا کہ ابھی ابھی لکھا جا چکا ہے یہ ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے تمام ایسے نظام جو انسانوں نے وضع کئے ہیں۔ خلاف فطرت اور خلاف منشاءِ ایزدی ہیں۔ یعنی رنگ۔ نسل۔ وطن۔ زبان وغیرہ کے

اشتراک سے نظامِ اجتماعی قائم کرنا۔ اِس کے خلاف وہ اِن تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر وحدت قومی کے لیے وحدتِ ایمان کو بنیاد قرار دیتا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس میں کوئی لچک نہیں۔ فرمایئے اِس چیز کو اس سے کیا تعلق کہ مسلم و غیر مسلم کا اُٹھنا بیٹھنا کھانا پینا۔ شادی غمی میں شریک ہونا جائز ہے۔ حیرت ہے کہ مولانا صاحب جیسی ہستی کہ جن کے علم و فضل کا شہرہ بام ثریا تک پہنچا ہوا ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ ہیئت اجتماعیہ کے اصول اور اکٹھے چلنے پھرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ باہمی اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے سے مسلم و غیر مسلم کی ایک متحدہ قومیت نہیں بن جائے گی۔ یہ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ عام معاشرتی آداب کی باتیں ہیں جن میں اسلام واقعی اپنے اندر لچک رکھتا ہے۔ لیکن وہ بھی صرف اُس وقت تک کہ یہ چیزیں اسلام کے کسی اصول سے نہ ٹکرائیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلمان کا کھانا کھا سکتا ہے' یہ لچک ہوئی۔ لیکن اگر وہ کھانا غیر خدا کے نام پر منسوب ہو تو خواہ ظاہری شکل میں کتنا ہی پاکیزہ اور صاف ستھرا کیوں نہ ہو اسے ایک مسلمان نہیں کھا سکے گا۔ یہ وہ اصول آ گیا جہاں لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مثلاً مسلمان۔ یہود و نصاریٰ کی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہے۔ لیکن ایک مشرکہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہاں پہنچ کر وہ لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کر سکتا ہے لین دین کر سکتا ہے۔ معاہدے کر سکتا ہے لیکن اِن کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتا۔ یہاں پہنچ کر اسلام کی لچک ختم ہو جائے گی۔ یہ ہے مطلب حضرت علامہؒ کے اِس فقرہ کا کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔

مذہب کا صحیح مفہوم

حضرت علامہؒ نے فرمایا تھا کہ یہ نظریہ قومیت جسے مولانا صاحب نے پیش کیا ہے۔ یورپ کا وضع کردہ ہے اور اس کے جہنمی نتائج آج دنیا کے سامنے ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"ممکن ہے کہ یورپ نے وطنیت اور قومیت کو کسی خاص مفہوم اور کسی خاص ہیئت اجتماعیہ کے لئے استعمال کیا ہو اور اس پر وہ گامزن ہو رہے ہوں۔ اور اِن مقاصد اور

نصب العین کو اپنے مذہبی اداروں کے مخالف پاکر مذہب کو سلام کر بیٹھے ہوں
یا مذہب کو صرف پرائیویٹ زندگی شمار کرنے لگے ہوں۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارا اقدام
متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف صرف انہی کیفیات اور لوازم کے ساتھ ہو جو کہ ان کے
یہاں ملحوظ ہو رہے ہیں" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۹)

مذہب کے متعلق ہم گزشتہ صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ قومیت پرست حضرات کے نزدیک مذہب صرف ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی وہ اجازت دے سکتے ہیں۔ وہ مذہب جو مسلمانوں کے تمام شعبہ ہائے زندگی کو محیط ہو۔ جو ان کے معاشی۔ معاشرتی اقتصادی۔ عمرانی۔ تمدنی۔ سیاسی۔ دینی۔ دنیاوی تمام امور پر حاوی ہو۔ اور جسد انسانیت میں بمنزلہ روح کے کام کر رہا ہو۔ قومیت پرست حضرات کے نزدیک ترقی کا دشمن۔ اور متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک خطرناک چٹان ہے۔ اس لئے پنڈت جواہر لعل نہرو دانت پیستے ہیں کہ اس قسم کا مذہب اور ایسے مذہب کے مدعی ابھی تک زندہ کیوں ہیں! اس کے باوجود مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارا اقدام متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف ان کیفیات کے ساتھ نہیں اٹھ رہا جو مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدت کی حیثیت دیتی ہیں یہاں پہنچکر تو ہمیں شبہ ہونے لگ گیا ہے کہ جہاں مولانا صاحب کی نگاہ قرآنی سیاست پر نہیں ہے وہاں وہ ملکی سیاست سے بھی بہت کم واقف ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت کس سے پوشیدہ ہے کہ متحدہ قومیت بنتی ہی اس وقت ہے جب یا تو مذہب ایک ہو۔ یا مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دیدی جائے۔ اس کے سوائے متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ اصل یہ ہے کہ مولانا صاحب اور اُن کے ہم مشرب حضرات کا مذہب کے متعلق تصور ہی جداگانہ ہے۔ اور یہ وہ تصور ہے جسے ایک عرصہ سے مسلمان کے سامنے صحیح اسلام بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور جب کبھی وہ مذہب یا اسلام کا لفظ زبان پر لاتا ہے تو اس سے اس کا مفہوم یہی تصور رہوتا ہے۔ یہ تصور کیا ہے؟ اسلام کے پانچ ارکان۔ کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ اگر کوئی اذان دینے میں مزاحمت نکرے نماز پڑھنے کی کسی جگہ ممانعت نہ ہو روزے بلا روک ٹوک رکھے جاسکیں زکوٰۃ کا روپیہ اپنی اپنی مرضی کیمطابق بکھیرا جاسکے اور حج کرنے کیلئے پاسپورٹ پر کوئی پابندی نہو تو یہ حضرات اسے عین مذہبی آزادی

قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک مذہب اِسی چار دیواری کے اندر گھرا ہوا ہے۔ اِن ارکان کی تکمیل سے اسلام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اِس سے زیادہ اسلام کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ کھانے پینے یا شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اِسی لئے یہ حضرات اِس دلیل کو نہایت بلند آہنگی سے پیش کرتے ہیں کہ دیکھو کانگریس نے کراچی کے ریزولیوشن میں مذہبی آزادی کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ وہ اقلیتوں کے مذہب کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں کہ

"کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور روفارکو ٹھیس نہ لگے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۱۲)

حتیٰ کہ پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے خدا کے منکر کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"جواہر لعل ہندو ہے اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے"[1] (تقریر مولانا حسین احمد صاحب مطبوعہ زمزم ۲۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

ان امور سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ یعنی "پانچ ارکان اسلام اور ان سے متعلقہ مسائل"۔ اس سے آگے "دنیاداری" کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ان امور کے لئے جس قسم کا نظام ملک میں قائم ہو جائے۔ وہ ان کے نزدیک "از روئے شریعت" جائز اور درست ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مولانا صاحب کا فتویٰ ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) کہ ایسی جمہوریت جس میں ہندو مسلمان سکھ پارسی۔ عیسائی شامل ہوں۔ عین اسلام کے مطابق ہے۔ یہ فتویٰ جس سے قصرِ اسلامی کی ایک ایک اینٹ گر جاتی ہے۔ محض اس بنا پر اس جرأت و بیباکی سے دیدیا گیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا دائرہ صرف پانچ ارکان اسلامی تک ہی محدود ہے۔ جب ان میں عدم مداخلت کی ضمانت مل جائے تو امور دنیاوی کے لئے جمہوریت سے بڑھکر اور کونسا نظام بہتر ہو سکتا ہے! لیکن انھیں کس طرح سمجھایا جائے

[1] حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لا یالونکم خبالا (۱) غیر مسلم تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ودوا ما عنتم جس بات سے تمھیں ضرر پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

کہ اس قسم کی جمہوریت جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو مسلمانوں کے لئے غلامی کی بدترین لعنت ہے۔ مسلمانوں کے باہمی امور کے فیصلوں کے لئے قرآن کریم نے ایک الگ اور جداگانہ نظام قائم کیا ہے جس کی بنیادی اینٹ یہ ہے۔ کہ فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم (تیرے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا حکم نہ بنائیں) اور نبی اکرمؐ سے ارشاد تھا کہ وشاورھم فی الامر (اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو) اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے) جس سے ظاہر ہے کہ اس مجلس مشاورت میں کسی غیر مسلم کا دخل نہ ہوگا۔ اور اس کا صدر خود مسلمانوں کا امیر ملّت۔ مرکز دین ہوگا چہ جائیکہ وہ نظام جمہوریت ایسا ہو جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ ایسی اکثریت کے فیصلوں کے متعلق تو قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

"کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا فیصلے کرنے والا (حکم) تسلیم کر لوں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کر دی ہے...... اور یوں تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ سمیع و علیم ہے۔

اور اگر تو زمین پر بسنے والوں کی اکثریت کی اطاعت کرے تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں۔ وہ تو صرف ظن (و قیاس) کی اتباع کرتے ہیں اور یونہی اٹکلیں دوڑاتے ہیں"۔ ۶/۱۱۵-۱۱۶

ان آیات مقدسہ کے معانی کی تفصیل طویل ہے لیکن ارباب نظر سے ان کا مفہوم پوشیدہ نہیں ہوگا۔ اسلام کا نظام اجتماعی یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلوں کے لئے کتاب اللہ بہ حیثیت اصولِ قانون قیامت تک کے لئے موجود ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے امامت کبریٰ کے مرکزِ اولین۔ جناب نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے۔ ان کے بعد یہ منصب امامت حضورؐ کے جانشینوںؓ کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا آج مسلمانوں کے لئے اسلامی نظام زندگی یہ ہوگا کہ ان کی اپنی جماعت ہو۔ اس جماعت کے

منتخب افراد پر مشتمل ایک مجلس مشاورت ہو اور ان میں اتقی (سب سے زیادہ متقی) ان کا امیر ہو۔ اور مسلمانوں کے تمام امور اس نظام کے ماتحت سرانجام پائیں۔ ایسے نظام کے بغیر محض نماز۔ روزہ سے جس قسم کا اسلام باقی رہتا ہے۔ اس کے متعلق ہم سے نہیں۔ بلکہ ایک قومیت پرست عالم دین کی زبانی سنئے۔ مولانا آزاد حیات اجتماعیہ اسلامیہ کی بحث کے دوران میں لکھتے ہیں (لیکن قومیت پرستی کے زمانہ سے پیشتر)

"احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہد صحابہؓ سے لیکر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک نہیں پہنچی ہو گی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلعم۔ انی امرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعۃ۔ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ۔ فھو من جھنم۔ قالوا یارسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صل و صام وزعم انہ مسلم۔

یعنی فرمایا۔ تم کو پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع طاعت۔ ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور)

کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ روزہ رکھتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا ہاں۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ روزہ رکھتا ہو۔ اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔

پہلی چیز جماعت ہے۔ یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اپنے مرکز قومی سے جڑ کر رہنا چاہیئے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیئے۔ آگے چلکر شہرت کے ساتھ ایسی حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوکر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک مذہبی سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے!

(الخلافۃ والجزیرۃ العرب۔ مولانا ابوالکلام آزاد)

اور اسی بنا پر مولانا آزاد نے کبھی فرمایا تھا کہ

"مسلمانوں کی قومیت صادقہ کا مدار صرف شریعت ہے" (خطبۂ صدارت لاہور)

ان امور سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ کانگریس جس قسم کی مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے وہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ میں سمٹ کررہ جاتا ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی رہتا ہے؟ اس سے آگے بڑھنے والا مذہب تو مسلمانوں کے اپنے الگ نظام اور اپنی الگ جماعت کے قیام کا مقتضی ہو جاتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جو انتہائی "فرقہ پرستی" پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا "قومیت پرستی" انہیں کس طرح اپنے دستورالعمل میں جگہ دے سکتی ہے؟ ہم مولانا صاحب کو کس طرح سمجھائیں کہ اسلام تو ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض مسلمانوں کی اپنی حکومت وسلطنت قرار دیتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور وہ اعمال صالحہ کرتے ہیں۔ یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اس دنیا کی حکومت عطا فرمائے گا۔

ذرا کانگریس سے کہیئے کہ اس قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیدے جو مسلمانوں کی اپنی حکومت کے قیام کی طرف منجر ہو، پھر دیکھیئے کہ کانگریس کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ اور جو مذہب مسلمانوں کو انکی اپنی حکومت کے

قیام کی طرف نہیں لے جاتا، وہ ایک پرائیویٹ عقیدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس قسم کے مذہب کی آج بھی آزادی حاصل ہے، اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت کانگریس کے ریزولیوشن دیتے ہیں جس پر مولانا صاحب اور اُن کے ہم مسلک حضرات یوں شاداں و فرحاں پھرتے ہیں۔ سچ فرمایا تھا حضرت علامہ نے کہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غیر اسلامی نظام

حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ "ہر وہ دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے"، اسکے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں:-

"اسی طرح یہ کہنا کہ نظام اسلامی اور اس کا کارپرداز کبھی دوسرے نظام کے ساتھ شریک ہی نہیں ہو سکتا۔ غیر قابل قبول امر ہے۔ قوانین اسلامیہ اور احکام شرعیہ نے اگرچہ بہت سے اُمور میں کوئی نہ کوئی تجویز قائم کردی ہے۔ مگر بے شمار اُمور کو زیر اباحت و اجازت رکھا ہے جن میں ہم کو اختیار رہتا ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کریں۔ ان ہی اُمور میں بادشاہتیں اور انکے حکام اور انجمنیں وغیرہ اپنے اپنے آراء و اعمال کو کام میں لاتی رہتی ہیں۔"

(متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۶۳)

یہاں پھر وہی بنیادی غلط فہمی اُلجھاؤ کا باعث بن رہی ہے۔ حضرت! دستور العمل اور نظام سے مراد وہ اصول حیات ہیں جو اسلام نے اپنے متّبعین کے لئے مرتب فرمائے ہیں۔ اور جو قوانین فطرت کی طرح اٹل ہیں۔ لا تبدیل لکلمات اللہ۔ اور آپ جن چیزوں کی اجازت و اباحت کا ذکر فرما رہے ہیں وہ ان اصول کی فروعات و جزئیات ہیں۔ مسلمانوں کی الگ اجتماعی زندگی کا قیام و وجود اصول اسلام میں سے ہے جس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ البتہ قومی اور جماعتی حیثیت سے دوسری قوموں کے ساتھ اشتراک عمل اور اس کا طریق کار فرعی چیزیں ہیں جنہیں اسلامی جماعت اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے ماتحت خود مرتب کر سکتی ہے۔ فرع اور اصول کا فرق ایسی بیّن چیز ہے جس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔

غیروں کا تشبہ

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کیا ہے جس کے لئے وہ اپنی عادت سے مجبور نظر آتے ہیں۔ اسلئے کہ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں اس قسم کی چیزیں بیان فرماتے رہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"بڑے بڑے دعویدار اسلامیت و مذہبیت ایسے ہیں جن کی صورت اور لباس میں اور انگریز کی صورت اور لباس میں فرق معلوم نہیں ہوتا" (ایضاً صفہ ۱)

ہر چند یہ چیز ہماری اصولی بحث کے دائرہ سے خارج ہے اور یوں بھی ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

لیکن چونکہ مولانا صاحب اس چیز پر خاص زور دیتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم ان سے اتنا دریافت کرنے کی جرارت کرتے ہیں کہ مغرب زدہ مسلمانوں کی اس "اتباع فرنگ" پر تو وہ آئے دن اعتراضات کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی نگاہ اُن مسلمان مہاشوں کی طرف کیوں نہیں اُٹھتی جو نہ صرف لباس میں ہی بلکہ آداب معاشرت میں بھی خالص "شری یُت" بنتے جا رہے ہیں۔ ان کو بھی تو کبھی ٹوکا ہوتا کہ یہ غیروں کا تشبہ اسلام میں جائز نہیں۔ ایک قومیت پرست اسلامی درسگاہ کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک مرتبہ بڑے فخر سے کہا کہ وہ جب پنجاب کے دورے کے لئے نکلے ہیں تو ہر جگہ "پنڈت جی نمسکار" کہہ کر ان کا سواگت کیا جاتا تھا! ایسے حضرات کے اسلام میں مولانا صاحب کو کبھی کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ لیکن اُن سے اختلاف رائے رکھنے والوں کی ہر چیز سے کفر ٹپکتا دکھائی دیتا ہے! اسے اگر "رنگین چشمہ" کی برکات نہ کہئے تو اور کیا کہئے!

میری نگاہِ شوق پر اس درجہ سختیاں   اپنی نگاہِ شوخ کی کچھ بھی سزا نہیں

شَہَادَۃٌ مِّنْ اَھْلِھَا

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے پیش نظر آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ایسی دو قومیں جن کا مذہب، تمدن، تہذیب، کلچر مختلف ہوں۔ جن کے نظریات زندگی الگ الگ ہوں نصب العین حیات جداگانہ ہوں۔ وہ قومیں قرآن کریم کی رو سے، باہم گھل مل کر، ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ جس کا اعتراف اب غیر مسلموں تک کو کرنا پڑ رہا ہے۔ مولانا

حسین احمد صاحب تو کفر و اسلام کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تشکیل کا وعظ فرما رہے ہیں۔ اور ان کے امیر یعنے صدر کانگریس مسٹر بوس کا یہ ارشاد ہے کہ :۔

"وہ کلچر۔ زبان۔ تہذیب۔ غرضے کہ ہر شئے میں۔ برطانیہ اور ہندوستان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لیے سوائے خوشگوار ہی تعلقات کے کوئی اور چیز ان ہر دو ممالک کو آپس میں نہیں ملا سکتی۔ اور ہندوستان کی طرف سے اس قسم کے تعلقات اسی صورت میں پیدا ہو سکیں گے جب یہ ملک کامل آزادی حاصل کر لیگا۔" (اسٹیٹس مین۔ مورخہ ۷ ۱۱/۳۸)

دیکھئے یہ ہے وہ جادو جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کانگریسی حضرات خود اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی مختلف قومیں جن میں تہذیب۔ تمدن وغیرہ کا اشتراک نہیں ہوتا۔ ایک متحدہ قومیت میں تحلیل نہیں ہو سکتیں۔ البتہ ان میں اچھے تعلقات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یعنے باہمی وفاق اور معاہدہ کی رو سے۔ اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ دونوں قومیں اپنے اپنے معاملات میں بالکل آزاد ہوں۔ لیکن یہی اصول جب مسلمان پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ ہندو اور مسلمان تہذیب۔ تمدن۔ مذہب وغیرہ میں ایکدوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے یہ دونوں ملکر متحدہ قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ البتہ ان میں باہمی اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور اسکی یہی شکل ہے کہ مسلمان اور ہندو اپنے اپنے معاملات میں دو جداگانہ اور آزاد قومیں ہوں اور انکے درمیان اشتراک عمل کا ذریعہ معاہدہ اور وفاق ہو۔ تو کانگریسی ہندو حضرات اسے اصول حریت نوازی کے خلاف بتاتے ہیں۔ اور قومیت پرست مولوی صاحبان اسے "سحر برطانیہ" کا پیدا کردہ کفر قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے قومیت پرست حضرات کا اصول سیاست اور یہ ہے اُن کا تفقہ فی الدین۔ یعنے یہ ہمارے آئمہ دین مسلمانوں کے ساتھ ملکر ایک اجتماعی زندگی بسر کرنے کو خلاف مذہب بتاتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر انکے نزدیک عین قرآن و حدیث کے مطابق ہے انکی فقہ میں میدان عرفات میں جمع ہونے والے مسلمان سب فرقہ پرست ہیں کہ وہ اپنی الگ۔ خالصتہً اسلامی جماعت کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ہری پور میں اکٹھے ہونے والے مسلمان اسلام کے صحیح ترجمان ہیں کہ وہ متحدہ قومیت کے علمبردار ہیں۔ انکے نزدیک ہندو اور مسلمان تو بھائی بھائی بن سکتے ہیں لیکن مسلمان اور مسلمان آپس میں مواخات کا رشتہ پیدا نہیں کر سکتے۔ یا للعجب۔

برہمن گفت برخیز از در غیر   زیاران وطن ناید بہ جز خیر

بیک مسجد دو مُلّا می نہ گنجد ز افسونِ بتاں گنجد بہ یک دیر (اقبال)

وطنیت کی جہنّم

حضرت علّامہ نے قرآن کریم کی روشنی میں بتایا تھا کہ وہ قومیت جس کی بنیاد وطنیت پر رکھی جاتی ہو نوعِ انسانی کے لئے کس قدر جہنمی زندگی پیدا کرنیکی موجب ہوتی ہے۔ اور وطنیت وہ جذبہ ہے جس کے بغیر بقول مولانا صاحب۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے کوئی رشتہ اتحاد بجز متحدہ قومیت نہیں جسکی اساس محض وطنیت ہی ہوسکتی ہے اسکے علاوہ اور کوئی چیز نہیں" (انصاری، ۱۴۸)

حیرت ہے کہ ایک طرف ہمارے علماء کرام ہیں کہ جنکے گھر میں سیاسی اور تمدنی زندگی کے تمام مسائل کے لئے درخشندہ اُصول موجود ہیں لیکن وہ ان اصولوں کے خلاف دوسروں کے نظریات زندگی کو نصب العین حیات بنا رہے ہیں اور دوسری طرف غیر مسلم ہیں کہ وہ چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر قرآن کریم کے انہی نظریات کو صحیح اُصول زندگی قرار دے رہے ہیں۔ اسی "وطنیت" کے متعلق گلے دنوں مسٹر کے نیٹرا جن نے بمبئی یونیورسٹی کے کانوکیشن ایڈریس کے دوران میں کہا تھا:۔

"عصر حاضر کا ایک مہیب ترین خطرہ جس سے بچنے کے لئے یونیورسٹی کے ہر فرد کو کامل جدوجہد کرنی چاہیئے یہ ہے کہ قومیت کا وہ تنگ نظریہ جس نے یورپ کو آج یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں سرایت نہ کر جائے۔ یہ وہ نظریہ ہے جسکی رُو سے غلط اور صحیح جائز اور ناجائز، جھوٹ اور سچ کے امتیازات "سودیشی" اور "بدیشی" کے امتیازات کے تابع ہو جاتے ہیں کبھی اس چیز کو ایّام جاہلیت کی یادگار سمجھا جاتا تھا کہ ہر وہ شے جو اجنبی اور بدیشی ہو اس سے نفرت کی جائے لیکن آج یہی چیز "قومیت" کا طرۂ امتیاز ہے جس میں ۹/۱۰ حصہ یہ اُصول ہے کہ وہ لوگ جو تمہارے ملک سے باہر رہتے ہوں۔ انکی طرف سے بدگمانی اور نفرت کے جذبات دلمیں موجزن رہیں۔ وہ قلب جو وطنیت کے ان جذبات سے متاثر ہو جاتا ہو۔ اخلاق کے تمام معیاروں کی طرف سے بے حس ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ آج حریت نوازی نام ہی اس چیز کا رہ گیا ہے کہ انسان اس اُصول

پر آنکھیں بند کر کے کاربند رہے کہ "میرا ملک غلط یا صحیح" (سب پر مقدم ہے)[1]" (اسٹیٹس مین ۴ ۱۱/۳۸)

یہ ہے وطنیت کا وہ ملعون جذبہ جس کی مخالفت اسلام نے اس شد ومد سے کی ہے اور جس کے متعلق حضرت علامہ نے آج سے آٹھ سال پیشتر اپنے مشہور خطبہ صدارت میں فرمایا تھا۔

"سیاسیات کی جڑ حقیقتاً انسان کی روحانی زندگی میں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی آراء کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک سوسائٹی ہے۔ یا اگر آپ پسند فرمائیں تو اسے ملکی اور مذہبی نظام کہہ سکتے ہیں۔ میرے سیاسیات میں دلچسپی لینے کا اصلی سبب یہ ہے کہ کہیں دور حاضرہ کے سیاسی اصول جو دہریت پر مبنی ہیں اسلام کے بنیادی اصولوں کو متاثر نہ کر دیں۔ میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم (وطنیت) کا سخت مخالف ہوں (اس نیشنلزم کی تعلیم ہے کہ قوم کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ وطن پر ہے) کیونکہ مجھے اس میں دہریت اور الحاد کے جراثیم نظر آ رہے ہیں۔ اور یہ جراثیم انسانیت کے لئے سخت مضر ہیں"

لیکن چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھنا تھا کہ اسی نظریہ وطنیت کو ایک دن ہندوستان کے سب سے اعلیٰ دارالعلوم کے سب سے بڑے کلید بردار کے مجلہ دماغ سے کتاب وسنت کا حسین ودلکش نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کے لئے فریب نگاہ بننا تھا۔ آج اسلام کی مظلومیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے صف ماتم بچھانے کا اس سے زیادہ اندوہناک مقام اور کونسا ہو سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس پر آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ شق ہو گئی۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک　　　سر برآر و ایں قیامت درمیان خلق بیں

اور پھر ستم بالائے ستم کہ یہ سب کچھ سہواً نہیں ہوتا بلکہ غلطی پر متنبہ کرنے والے مرد حق شناس کو ساحر برطانیہ کے طلسم وافسوں کا شکار بتایا جاتا ہے۔ اور دین حجازی کے اس محرم اسرار کو "افرنگ زدگی" کا طعنہ دے کر "برطانیہ کی عظیم الشان خدمات انجام دینے والا" قرار دیا جا رہا ہے اور یہ سب اس جرم کی بنا پر کہ وہ اس دور تجدد پسندی میں اس رسم کہن کی یاد کیوں تازہ کر رہا ہے کہ جس کی رو سے مکہ کا بوجہل گلے نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن فارس کا سلمانؓ "اہل بیت" میں سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بچارے کی مجبوری پر بھی تو نگاہ رکھیئے کہ جسے قرآن کریم کا ہر حرف پکار پکار

---

[1] مسٹر سروجنی نائیڈو نے بھی اپنی ایک تقریر میں قومیت کے متعلق قریب قریب یہی کچھ کہا ہے ملاحظہ ہو اسٹیٹس مین ۱۲/۳۸-۲۱ منہ

کرکہہ رہا ہو کہ یہ نظریہ ہے کہ :-

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

اور جیسے حضورِ رسالتمآب کے خاکِ قدم کا ہر ذرہ اُبھر ابھر کر دکھا رہا ہو کہ یہ وہ اصول سیاست ہے کہ

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ کس طرح آپ کی ہمنوائی میں شریک ہو جائے اسی مجبوری کی بنا پر تو اس نے کہا تھا کہ :-

غلامم جز رضائے تو نجویم جز آں راہے کہ فرمودی نپویم

و لیکن گر بہ ایں ناداں بگوئی خرے را اسپ تازی گو۔ نگویم (اقبال)

آخری گذارش

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ کی "آخری گذارش" میں فرمایا ہے

"ہم اس عرض کے بعد اپنی تحریر کو اس فلسفیانہ تقریر اور شاعرانہ تخیل کے جوابات سے طویل اور دراز کرنا مناسب نہیں سمجھتے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے فلاسفری دماغ سے تراش کر کے ذکر فرمائی ہے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۷۶)

اور اس رسالہ کے دیباچہ نگار صاحب نے اس کے مقصد کا ان گہربار الفاظ میں تعارف کرایا ہے :-

"حضرت شیخ مدظلہ نے اس بحث کے ذیل میں جن مذہبی اور سیاسی جواہرات کے منتشر ذخائر کو مجتمع فرما دیا ہے وہ نہ صرف متلاشیان حق کے لئے سرمایۂ طمانیتِ قلب ہی ہیں بلکہ ان سے یقیناً ہماری حیات سیاسی کے ایک شاندار باب کی تعمیر ہوگی اور موجودہ و آئندہ نسلیں اسلامی نقطۂ نظر سے قومیت متحدہ کے مفہوم کو سمجھنے میں کسی سفسطہ کا شکار نہ ہو سکیں گی۔

کاش علامہ اقبال مرحوم آج ہم میں موجود ہوتے تو جو شبہات اس مسئلہ خاص کے بارے میں انہیں باقی رہ گئے تھے وہ بھی دُور ہو جاتے" (ایضاً صفحہ ۳)

اس مطلع اور مقطع کے متعلق ہم کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ کیونکہ یہ اُس وقت درج کئے جا رہے ہیں جب حضرت علامہ کے استدلالات، مولانا صاحب کے اعتراضات اور انکے جوابات قارئین کے سامنے آچکے ہیں۔ وہ از خود فیصلہ کر لیں گے کہ قرآن کریم کی رُو سے کونسا نظریہ ملّتِ اسلامیہ کی زندگی کا ضامن ہے اور کونسا انکی خودکشی کے مترادف

وہ کونسی حیات انگیز جرس کارواں ہے جو بلالؓ کے نغمۂ عشق کو اپنے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہو اور وہ کونسی سکوت افزا بنسری کی لے ہے جو نا قوسِ برہمن کے شور میں گم ہو جانے میں ہی رازِ حیات پوشیدہ دیکھتی ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت علامہ اگر آج ہم میں موجود ہوتے تو وہ مولانا صاحب کی اس تحقیق انیق کی داد کن الفاظ میں دیتے۔ البتہ جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ تو اتنا ہی ہے کہ یا تو مولانا صاحب "متحدہ قومیت" اور "ہندو مسلم اتحاد" کے فرق کو ہی نہیں سمجھ سکے اور یا متحدہ قومیت کے متعلق اسلام کی تعلیم انکی نگاہوں سے یکسر او جھل ہے اگر پہلی بات ہے تو ملتِ اسلامیہ کے لئے ماتم کا مقام ہے کہ یہ حضرات جو قوم کی کشتیٔ سیاست کے ناخدا ہونیکے مُدّعی ہیں۔ سیاست حاضرہ کی اس ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ اور اگر دوسری بات ہے تو پھر معاف فرمایئے یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ ایسا "فقیہہ ملت"۔

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

خلاصہ بحث

بحثِ قومیت کو اگر ہم چند مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہا جائیگا کہ مولانا صاحب کے نزدیک ایک ملک کی جغرافیائی حدود کے اندر رہنے والے انسان عقائد و اعمال کے تمام اختلافات کے باوجود ایک قوم بن سکتے ہیں اور ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ یہ نظریۂ قومیت غیر اسلامی ہے۔ اسلام کے نزدیک صرف وہی افراد مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں جن میں وحدت ایمان و عمل ہو۔ مولانا صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات میں یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ قوم نوحؑ اور قوم ابراہیمؑ میں تمام مومن و کافر شامل تھے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ حضرات انبیاء کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ اس قوم میں ایسے افراد کو الگ کر کے جن میں وحدت عمل و ایمان ہوتی تھی، ایک جُداگانہ نئی قومیت کی تشکیل فرماتے تھے۔ یہ قومیت اسلامی قومیت کے معیار کے مطابق تعمیر ہوتی تھی۔ ہم نے اپنے دعوے کے اثبات میں کتاب و سنت کی نصوص صریحہ پیش کی ہیں لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہمیں چونکہ فریق مقابل سمجھا جائیگا۔ اس لئے اس باب میں کسی آخری فیصلہ تک پہنچنے کے لئے کسی حَکَم کی ضرورت محسوس ہو گی۔ آیئے ہم آپکے سامنے ایک ایسے حَکَم کا فیصلہ پیش کر دیں جو مولانا صاحب کے

نہ صرف ہم مسلک ہیں بلکہ جن کی علمی قیادت اور دینی امامت کے خود مولانا صاحب بھی معترف ہیں ۔ سنیئے کہ ان
کا فیصلہ کیا ہے ۔ اور پھر غور فرمائیے کہ یہ حضرات آج کس کے جادو سے مسحور ہو رہے ہیں ۔

مولانا ابوالکلام آزاد البلاغ بابت ۱۲ ۱۱/۱۵ و ۲۶ ۱۱/۱۵ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"قرآن حکیم میں اگرچہ نبوت کے عام اشتراک جنسی کی بنا پر تمام انبیاء کرام کا نام ایک ساتھ اور ایک حیثیت
سے آیا ہے ۔ لیکن بعض خصوصیات نوعی کے لحاظ سے اس نے انبیاء کے جو مختلف طبقات قائم کر دیئے ہیں ان
میں دو سلسلے عام طور پر ممتاز نظر آتے ہیں ۔

ایک سلسلہ ان انبیاء مؤسسین کا ہے جنہوں نے اپنی دعوت کے ذریعہ نئی قومیتوں کی بنیاد ڈالی اور
جو قدیم عمارتوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ از سر نو ایک نئی قومی عمارت بنانے کے لئے آئے تھے ، دوسرا سلسلہ
انبیاء مجددین و محدثین (بالفتح) کا ہے جنہوں نے کسی نئی اُمت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ کسی پیشتر کی قائم شدہ
اُمت صالحہ کی مزید تکمیل و تبلیغ کی یا امتداد عہد کے نتائج مضلہ و استیلائے بدعات و محدثات سے اسے
نجات دلا کر فرض تجدید و احیاء ادا کیا ۔

انبیاء مؤسسین

پہلے سلسلہ کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وہ تمام قدیم نظام ۔ قدیم عقائد اور قدیم اخلاق و مقومات
کو مٹا کر ایک جدید قومیت صالحہ کی بنیاد ڈالتا ہے اور اس کو آب و ہوا اور جغرافیانہ حدود طبعیہ کے اثر سے
الگ کر کے صرف مذہبی آب و ہوا میں ترقی اور نشو و نما دیتا ہے ۔ قرآن حکیم میں خدائے تعالے نے اس صنف
کے ایک نمایاں سلسلے اور اسکی ممتاز کڑیوں کا ذکر متعدد موقعوں پر ایک ساتھ کیا ہے ۔

الم یاتهم نباء الذین من قبلهم قوم نوح وعاد وثمود وقوم ابراهیم واصحاب
مدین والمؤتفکت اتتهم رسلهم بالبینت فما کان الله لیظلمهم
ولکن کانوا انفسهم یظلمون (۹-۷۱)

کیا ان منکرین حق تک ان لوگوں کے نتائج اعمال کی خبر نہیں پہونچی جو ان سے پہلے گذر چکے
ہیں ؟ یعنے نوح ۔ عاد ۔ ثمود اور ابراہیم کی قوم نیز مدین کے رہنے والے اور وہ بدبخت جن کی
بستیاں اُلٹ دی گئیں ۔ (یعنے قوم لوط) ان سب کے پاس ہمارے پیغمبر دلائل اور نشانیاں

لے کر آئے تاکہ وہ ہدایت و سعادت حاصل کریں اور اپنی بداعمالیوں کے نتائج مہلکہ سے نجات پائیں۔ خدا ان لوگوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا تھا، پر افسوس انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا!

اس آیہ کریمہ میں خدائے تعالےٰ نے اول حضرت نوح کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ایک نئی امت صالحہ کی بنیاد رکھی اور انکے بعد ان جماعتوں کا ذکر کیا ہے جن میں دعوت نوحی کے مجددین آتے رہے، پھر حضرت ابراہیم کا نام لیا ہے جو حضرت نوح کے بعد دوسرے دور قومیت کے مصدر ربانی تھے اور پھر انکے بعد کی دعوت ہائے مجددہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دعوت نوحی

انبیاء موسسین علیہم السلام میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت موسسہ سامنے آتی ہے جو پہلے صنف انبیاء میں بلحاظ تقدم عہد کے ایک مخصوص امتیاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک جدید قوم پیدا کی اور اس کو مذہبی امتیازات و مقومات کی آب و ہوا میں پرورش کرنا چاہا۔ جن لوگوں نے مذہب کی اس حبل المتین کو مضبوط پکڑا عذاب الٰہی سے نجات پائی۔ مگر جن لوگوں نے اس سررشتہ حیات کو چھوڑ دیا ہلاک ہوگئے اور باوجود رحمی و نسلی تعلقات کے خدا نے انکو نوح علیہ السلام سے بیگانہ قرار دیا انکی دعوت کی بنیاد نسل اور جغرافیہ نہ تھا وہ ایک نئی قوم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسلئے خود انکی نسل جسمانی کے رشتہ کا بھی کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ ان کا گھرانا اب وہی قوم تھی جو حق و سعادت کے رشتہ میں منسلک ہو کر طیار ہوئی تھی اور سب سے پہلے وہ خود ہی اپنے پیدا کردہ خاندان ملت کے ایک رکن ہوگئے تھے اگرچہ وما امن معہ الا قلیل۔

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحَاكِمِیْنَ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۱ - ۴۷)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ خدایا! تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تیرے خاندان کو عذاب طوفان سے نجات دی جائیگی تو احکم الحاکمین ہے تیرا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ میرے لڑکے کو اس عذاب سے نجات دے کیونکہ وہ میرے خاندان میں داخل ہے۔ خدا نے کہا اے نوح! تو جس کو اپنا اہل کہہ رہا ہے وہ تیرا اہل نہیں ہے۔ تیرا گھرانا تو درصل عمل صالح

کا گھرانا ہے (جس کی دعوت دیکر تو ایک صالح قوم پیدا کرنی چاہتا ہے) جو اس گھرانے میں داخل ہوا وہ تیرا ہے اور جو اس سے نکل گیا وہ تیرا نہیں رہا۔ بلکہ ان کے گھرانے کا فرزند ہو گیا جنکے عمل بد کو اس نے اختیار کیا۔ پس مجھ سے وہ سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں دیا گیا۔

اے نوح! یہ نصیحت میں اسلئے کہتا ہوں تاکہ حقائق و اسرار الٰہی تجھ پر کھلیں اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جائے جو علم حقیقت سے محروم ہیں۔

تشریح مزید

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو حکم دیا تھا کہ عذاب طوفان سے بچنے کے لئے کشتی بناؤ۔ جب کشتی بن چکی تو فرمایا

احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلك (۱۱-۲۲)

کشتی میں تمام ضروری حیوانات و انواع کا ایک ایک جوڑا رکھ لو نیز اپنے گھرانے کے آدمیوں کو بھی سوار کرا لو۔

لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ بھی کر دیا تھا جنکے متعلق پہلے فرمان ہو چکا تھا کہ اپنے کفر و تمرد کی وجہ سے وہ اس عذاب میں ضرور حصہ پائیں گے اور انکے لئے کوئی طلب اور کوئی سوال مقبول نہ ہوگا۔

الا من سبق علیه القول مگر ان لوگوں کو ساتھ نہ لو جنکی نسبت پہلے حکم ہو چکا ہے۔

وہ پہلا حکم یہ تھا کہ لا تخاطبنی فی الذین ظلموا۔ جن لوگوں نے حق و عدالت سے انحراف کیا اور اپنی سرکشی و عدوان سے غضب ایزدی کے مورد ٹھیرے سو انکی بابت مجھ سے کچھ نہ چاہنا۔

لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح کو انکے "اہل" و اقارب کو بچا لینے کا حکم دیا تھا اور ان کا بیٹا بدرجہ اولیٰ لفظ "اھل" کے جسمانی مفہوم میں داخل تھا اس لئے آپ کو جرأت ہوئی اور جناب خداوندی میں اسے اپنا "اھل" قرار دے کر سوال کیا اس پر جواب ملا کہ انه لیس من اھلك گو بظاہر وہ تمہارے اہل میں سے تھا لیکن در اصل اسے تم سے کوئی تعلق نہیں۔ "اہل" میں وہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ سرے سے تمہاری قوم ہی میں داخل نہ رہا بلا شبہ وہ تمہاری قوم اور تمہارے گھرانے میں سے تھا لیکن اب تو تمہاری قوم دوسری ہو گئی۔ تم نے حق اور راستی کی روح پیدا کر کے جو نئی قومیت صالحہ پیدا کی ہے اب سے وہی تمہاری قوم وہی تمہارا گھرانا وہی تمہارے

اہل ہیں۔ تمہارا رشتہ صرف اس نئی قوم ہی کا رشتہ اساس ہونا چاہیئے۔ وہ رشتہ خون اور جسم کا نہیں بلکہ حق اور دعوت حق کی روح کا ہے۔ اسی رشتہ میں منسلک کرکے یہ نئی قوم" دعوت نوحی" سے پیدا کی گئی ہے تمہارے جسمانی تعلقات کے جو" اہل" اس قومیت میں داخل نہ ہوئے وہ تم سے کٹ گئے اور تمہاری جگہ" عمل غیر صالح" کی فرزندی میں داخل ہوگئے"!

آگے چلکر تحریر فرماتے ہیں:۔

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت درصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائق نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان انبیار کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بنا پر انکی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقت در حربہ تیار کریں اس قربانی کا انکے تمام کاروبار دعوت میں سب سے زیادہ کارکن ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعی الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اُجاڑ دیا اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا جسکی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔

چنانچہ انبیار کرام و رسل عظام کے اس سلسلہ میں جنہوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے اور چونکہ انکی دعوت اسی پہلی قسم کی دعوت تھی۔ اسلئے ضرور تھا کہ اس اولین قربانی کا بھی وہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب اُنہوں نے اپنے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمہارا بیٹا عمل صالح کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جسکی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمہارا عزیز تھا لیکن اس نے عمل صالح کی جگہ عمل غیر صالح سے رشتہ جوڑا پس اب اس کا ذکر بیکار ہے اور یہ بنار قومیت کا وہ ناموس الٰہی ہے جس کا تمہیں علم ہونا چاہیئے۔

قال رب انی اعوذ بك ان اسئلك ما لیس لی به علم۔ حضرت نوح نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار میں اپنے ضعف بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں کہ جس چیز کی حکمت و حقیقت پر میری نظر نہ تھی۔ میں نے اسکی نسبت تجھ سے سوال کیا!"

پھر ارشاد ہے۔

حضرت نوح علیہ السّلام نے جس نئی امت کی بنیاد رکھنی چاہی تھی اگرچہ ضلالتِ عصر اور جہلِ انسانیت اس سے دست و گریباں رہی اور اسلیئے ما اٰمن معہ الا قلیل (۱۱-۴۰) انہیں ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی۔ مگر ایک چھوٹی جماعت کو۔

تاہم جس اُمّت صالحہ کی اس عہد اُولی میں بنیاد پڑی تھی وہ ضائع نہ گئی۔ اور خدا کا کوئی حکم و دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوح پر بہت کم لوگ ایمان لائے کیونکہ انسانی تمدن و عمران کا بالکل عہدِ طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم تر دور تھا اور مذہب کا سلسلۂ ارتقا ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور اُنکے صدیقین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لے گئی

. . . .

یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوح کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لیئے نہ تھی بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہوکر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے۔ اور اس کی بنیاد محض اخوۃ دینی پر قایم ہوتی ہے پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوری رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصّہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اسکے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔" (اختتام اقتباس البلاغ)

. . . .

یہ تو ہے وہ نظریۂ قومیت جسکے ہم مدعی ہیں اسکے برعکس یورپ کا وہ نظریۂ قومیت جس کی بنیاد جغرافیائی حدود پر رکھی جاتی ہے۔ اسکے متعلق مولانا آزاد کا صرف ایک فقرہ نقل کر دینا کافی ہے جو انہوں نے البلاغ بابتہ ۱/۱۵ ۲۶ کے عربی افتتاحیہ میں بیان فرمایا ہے۔ آپ تعلیم فرنگ کے مختلف پہلوؤں پر ماتم کرتے ہوئے نظریۂ قومیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

والقومیۃ القومیۃ!! العنوھا ان کنتم مومنین

اور یہ قومیت قومیت (کا شور) اگر مومن ہو تو اس پر لعنت بھیجو!

اسکے بعد ہم مولانا حسین احمد صاحب کی خدمت میں سوائے اسکے اور کیا عرض کریں کہ :-

فبای حدیث بعدہ یومنون ا

طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ۔ جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی سنہ ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیّت نہیں ہے بلکہ تمام اُمّتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اس کا

نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا، قرآن کریم کے حقائق وعلوم کی اشاعت، سیاسیاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچّی رہنمائی ہے۔

جو لوگ!

مغربی علوم وفنون سے مرعوب ہو چکے ہیں اُن کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دُنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اُس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

بلند پایہ مضامین!

کا اندازہ اِس سے لگایئے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور وفکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ؎

نمونہ مُفت طلب فرما کر خریداری کا فیصلہ کیجئے! (منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی)